ماہنامہ
جہد حق

پاکستان کمیشن
برائے انسانی حقوق
HRCP

جلد نمبر 27.....شمارہ نمبر 10 ..... اکتوبر 2020 (قیمت 10 روپے)

Monthly JEHD-E-HAQ - October 2020 - Registered No. CPL-13

فرقہ واریت کا حاصل کیا ہے، سوائے غارت گری کے؟

22 ستمبر 2020

سالانہ عمومی اجلاس 2020 اور کونسل کے انتخابات 2020-23

نوٹس

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) کا سالانہ عمومی اجلاس (اے جی ایم) 8 نومبر 2020 بروز اتوار کمیشن کے مرکزی دفتر/سیکرٹریٹ 107 ٹیپو بلاک نیو گارڈن ٹاؤن لاہور میں منعقد ہوگا۔ تمام وہ اراکین جن کے واجبات ادا ہو چکے ہیں، اجلاس میں شرکت کے حقدار ہیں۔

وہ اراکین جو کمیشن کے ضمنی قوانین میں ترامیم چاہتے ہیں اپنی تجاویز اس نوٹس کے موصول ہونے کے بعد جتنی جلدی ممکن ہو سکے سیکرٹریٹ بھیج دیں تاکہ جنرل باڈی کو بروقت مطلع کیا جا سکے۔

اراکین اے جی ایم میں شرکت اپنے ذاتی خرچ پر کرتے ہیں۔ دفتر بیرون شہر سے آنے والے اراکین کو رہائش فراہم کرنے میں مدد فراہم کرے گا، بشرطیکہ وہ سیکرٹریٹ (محترم محمد الیاس) کو 2 نومبر 2020 بروز پیر تک رہائش کی قسم اور دورانیے کے بارے میں آگاہ کر دیں۔ جہاں تک ممکن ہو سکا، ایچ آر سی پی، کووڈ 19 کی صورتِ حال کے پیشِ نظر، سماجی فاصلے اور صحت وصفائی سے متعلق ایس او پیز کے اطلاق کو یقینی بنائے گا۔

اے جی ایم 2020 کا ایجنڈا

08:30-09:00	رجسٹریشن/ ریفرشمنٹ/ پولنگ کا آغاز
09:00-09:15	ایجنڈے اور گذشتہ اے جی ایم کی کاروائی کی منظوری
09:15-10:15	سیکرٹری جنرل کی رپورٹ
10:15-11:15	علاقائی دفاتر کی رپورٹس (کوئٹہ، تربت، پشاور، لاہور، ملتان، کراچی، حیدرآباد، گلگت اور اسلام آباد)
11:15-11:30	خزانچی کی رپورٹ، آڈیٹرز کی تعیناتی
11:30-12:15	ضمنی قوانین میں ترامیم
12:15-13:30	عمومی بحث/ اے جی ایم کے بیان کے لیے اراکین کی تجاویز
13:30-14:30	دوپہر کا کھانا
14:30-16:40	سیمینار
16:40-17:00	انتخابات کے نتائج کا اعلان
17:00-17:15	اے جی ایم کا بیان اور ماحصل

نوٹ: پولنگ صبح 09 بجے شروع ہوگی اور دوپہر 02 بجے بند ہوگی

ہم اجلاس اور انتخابی عمل میں آپ کی شرکت کے متمنی ہیں

ڈاکٹر مہدی حسن

چیئرپرسن

جبری گمشدگیوں کا خاتمہ کیا جائے

جبری گمشدگیوں کے متاثرین کے عالمی دن کے موقع پر، پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) حکومت کو جبری گمشدگیوں کو جرم قرار دینے کے اُس کے وعدے کی یاد دہانی کراتا ہے۔ اسلام آباد ہائی کورٹ کے 2018 کے فیصلے کی مطابقت میں، نہ صرف اس ظالمانہ سرگرمی کو ایک واضح اور الگ جرم قرار دیا جائے اور مجرموں کو انصاف کے کٹہرے میں لایا جائے بلکہ متاثرین اور اُن کے خاندانوں کو معاوضہ بھی ادا کیا جائے۔ اسلام آباد ہائی کورٹ نے اس فیصلے میں جبری گمشدگیوں کو بجا طور پر انسانیت کے خلاف جرم قرار دیا تھا۔

یہ اَمر شدید تشویش کا باعث ہے کہ بہت سے متاثرین اداروں یا جبری گمشدگیوں میں ملوث افراد کی جانب سے انتقامی کارروائی کے خوف کے باعث کسی کی مدد حاصل کرنے یا اپنے کیسز کی تشہیر سے ڈرتے ہیں۔ ایچ آر سی پی کا یہ دیرینہ موقف رہا ہے کہ سرکاری اعداد و شمار میں جبری طور پر گمشدہ افراد کی تعداد بہت کم بتائی جاتی ہے جس سے جبری گمشدگیوں سے متعلق تحقیقاتی کمیشن کی افادیت کے بارے میں سوالات جنم لیتے ہیں۔

اگرچہ بلوچستان سے تعلق رکھنے والے ڈاکٹر دین محمد جیسے متاثرین 11 سال کے طویل عرصے سے لاپتا ہیں، تاہم یہ رجحان بھی پریشان کُن ہے کہ کئی افراد کو مختصر سے عرصے کے لیے جبری طور پر لاپتا کیا جاتا ہے اور پھر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ ایسے کئی واقعات میں اُنہیں تشدد کا نشانہ بنایا گیا اور اپنا کام جاری رکھنے سے روکا گیا، چاہے اُن کا تعلق قوم پرست تحریکوں سے ہو، انسانی حقوق کی جدوجہد سے ہو، یا پھر تنقیدی صحافت سے۔ ایچ آر سی پی مطالبہ کرتا ہے کہ جبری گمشدگیوں کے حوالے سے 2010 میں قائم کیے گئے عدالتی کمیشن کے مشاہدات منظرِ عام پر لائے جائیں اور جبری گمشدگیوں سے متعلق تحقیقاتی کمیشن کی ایک ایسے آزادانہ ٹرائبونل کے طور پر تشکیلِ نو کی جائے جو محض تحقیقات نہیں بلکہ انصاف فراہم کرنے کے بھی قابل ہو۔

[پریس ریلیز۔ لاہور۔ 30 اگست 2020]

فہرست

پریس ریلیز	03
کافر کافر کی واپسی	04
انتہاپسندی کی جڑیں	05
مذہب کی جبری تبدیلی؛ اور اس کی روک تھام کے لئے ضروری اقدامات کا جائزہ	06
عورت سوال اٹھاتی ہے	09
جنسی تشدد سہنے والی خواتین کو سمجھنے کے لیے ہم کچھ نہیں کر رہے	10
سماجی حقوق سے متعلق بنیادی معلومات	11
خالق کی تخلیق میں ادھورا پن تلاش مت کیجئے	16
بلوچستان کو بھی بالآخر تصویر مل گئی	
لیڈی ہیلتھ ورکر کے مبینہ قتل کے خلاف احتجاج	18
شاہینہ شاہین کے قاتلوں کو گرفتار کیا جائے	19
صنف کی بنیاد پر تشدد	20

کافر کافر کی واپسی

محمد حنیف

میٹرک کے امتحانوں کے بعد آنے والی چھٹیوں میں لڑکپن اور جوانی کے بیچ میں جھولتے لڑکے زندگی کی کوئی نئی چیز دریافت کرتے ہیں۔ کوئی باڈی بلڈنگ کرنے لگتا ہے۔ کسی کو سونے کی لت لگ جاتی ہے۔ کوئی عشق ڈھونڈتا پھرتا ہے اور کوئی مسجد جا کر اذانیں دینے لگتا ہے۔

انھی لمبی اور بور دوپہروں میں ہمارے ایک کلاس فیلو نے کُفر ڈھونڈ لیا۔ ایک کونے میں جا کر شلوار کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک پمفلٹ نکالا اور کہا اسے پڑھو اور سمجھو کہ یہ شیعہ ہمارے بارے میں کیا کہتے ہیں۔

ایک پیرا پڑھ کر ہی کان سرخ ہو گئے۔ مذہبی شخصیات کے بارے میں اتنی غلیظ باتیں کہیں سُنی نہ پڑھیں تھیں۔ میں نے پوچھا یہ تمھیں کس نے دیا، اُس نے ایک سُنی انجمن کا نام بتایا جو چھ دفعہ نام بدل کر آج بھی موجود ہے۔

ابھی میٹرک کے نتائج میں نمبر آئے تھے کہ شہر میں ایک ڈاکٹر قتل ہوا۔ ڈاکٹر شیعہ تھا لیکن لا اینڈ آرڈر کا معاملہ قرار دیا گیا۔ دو ہفتے بعد دوسرے ڈاکٹر کا قتل ہوا تو پہلی دفعہ لفظ 'فرقہ وارانہ' سنائی دیا۔

اس کے بعد ایک سلسلہ شروع ہوا کہ ہم جوان ہو کر بزرگ ہو گئے۔ شہر بدلے، پیشہ بدلا لیکن کہیں پر کوئی ڈاکٹر، کوئی وکیل، کوئی پروفیسر مارا جاتا رہا۔ ہم اور ہمارے جیسے تجزیہ نگار اس کی تاویلیں ایرانی انقلاب اور سعودی عرب کی مجبوریوں میں ڈھونڈتے رہے۔

ساتھ ساتھ یہ بھی یاد دلاتے رہے کہ دیکھیں کہ اگرچہ ہم سُنی ہیں لیکن ہمارا تجربہ یہ کہتا ہے کہ یہ ایک بیرونی سازش ہے۔

پاکستان میں فرقہ واریت کے بارے میں ہر بات کرنے سے پہلے ہمارے قارئین کو یہ یاد کروانا لازم ہے کہ والد سُنی ہیں (یا یہ کہ ہم صرف مسلمان ہیں)۔ تاکہ کوئی ہمیں 'وہ' نہ بولے۔

اس پورے دور میں مارنے والے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہہ رہے ہیں کہ ہم مارتے ہیں، اور بھی ماریں گے۔ (ملک اسحاق ضمانت پر رہا ہوئے۔ ٹی وی پر لائیو انٹرویو میں اینکر نے پوچھا کہ آپ کا کیا لائحہ عمل ہے۔ جواب آیا وہی جو پہلے تھا)۔

مرنے والے چیخ چیخ کر ایسے قاتلوں کے نام سناتے رہے۔ (کوئٹہ کے ہزارہ سخت سردی میں سینکڑوں لاشیں سڑک پر رکھ کر ایسے قاتلوں کے نام اور پتے بھی بتاتے رہے)۔

حکومت علما سے مشورے کرتی رہی، تجزیہ کار عالمی سیاست کے نقشے سجاتے رہے۔ اور ہمارے پیارے سُنی بھائی، معصوم سُنی بھائی یہ یاد دلاتے رہے کہ ایک تو ہم سُنی ہیں، ہم تو خود محرم میں سبیلیں لگاتے ہیں اور ان کو بھی تو چاہیے کہ اپنا گھوڑا چار دیواری کے اندر رکھیں۔

جب یہ آگ طاقت کے ایوانوں تک پہنچی تو ریاستی ادارے حرکت میں آ گئے۔ کچھ کو دہشت گرد قرار دے کر پولیس مقابلوں میں مروایا گیا۔ کچھ کو اگلے مورچوں کی سیر کروائی گئی اور فوٹو کھنچوائے گئے تاکہ سب پھر سے بھائی بھائی بن جائیں۔

لیکن جن بچوں کے کانوں میں اڑتیس سال پہلے کافر کافر سنایا گیا تھا اب وہ یہ ملک چلا رہے ہیں، انجمن تاجران کے چیئرمین ہیں، بیوروکریسی کے بڑے بابو ہیں، باقی ریاستی ادارے جن کا نام لینا منع ہے، ان میں بھی بڑے عہدوں پر فائز ہیں۔

جب یہ بچے تھے تو اس تقسیم شدہ اور بکھرے ہوئے ملک کو یا علی مدد کا نعرہ جوڑتا تھا۔ مل مزدوروں کی اور محاذ پر لڑتے فوجیوں کی بھی ہمتیں جواب دینے لگتی تھیں تو کہیں نہ کہیں سے 'نعرہ حیدری' بلند ہوتا تھا اور کوئی اسے فرقہ وارانہ نعرہ قرار نہیں دیتا تھا۔

کراچی میں امیر یزید کے نعرے لگے تو اگلے دن پھر بین الاقوامی سازش کہہ کر تسلی دی گئی۔ یہ تکلف نہیں کیا گیا کہ بتایا جائے کہ یہ نعرہ کہاں بیٹھ کر کس نے ایجاد کیا۔ دو دن بعد اسلام آباد میں یہ مطالبہ بلند ہوا کہ شیعوں کے ساتھ وہی کیا جائے جو احمدیوں کے ساتھ کیا گیا تھا۔

اسلام آباد سے کسی نے پلٹ کر یہ بھی پوچھا کہ 'ہیں؟ ہم نے احمدیوں کے ساتھ کیا کیا تھا؟'

اب سے 12، 14 سال پہلے شیعہ برادری کے ساتھ وہ ہوا تھا کہ یہ بحث جاری تھی کہ کیا اسے نسل کشی کہنا جائز ہے؟ اور کافر کافر کی گونج میں اتنے ہی شیعہ مارے گئے تھے کہ بقول شخصے احمدی بھی کہہ اٹھے تھے یا اللہ تیرا شکر کہ ہم کافر ہیں شیعہ نہیں۔

(بشکریہ بی بی سی اردو)

جہدحق پڑھنے والے توجہ کریں

- آپ نے اس شمارہ کا مطالعہ کیا۔

جو خامیاں / کمزوریاں آپ کو نظر آئی ہوں۔ ان کی نشاندہی خط کے ذریعے سے کیجئے۔

- آپ بھی اپنے علاقے میں ہونے والی انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کی رپورٹ / اطلاع ہمیں اس رسالہ میں چھپنے والا رپورٹ فارم پُر کر کے بذریعہ ڈاک روانہ کر سکتے ہیں۔ حقائق اچھی طرح سے تصدیق کر کے لکھیں۔

HRCP کارکن متوجہ ہوں

''جہدحق'' کے لیے رپورٹ فارم کے مطابق کوائف پر مبنی رپورٹیں، خبریں، تصاویر اور انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں سے متعلق دیگر مواد مہینے کے تیسرے ہفتہ تک پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق کے مرکزی دفتر میں پہنچ جانا چاہیے تاکہ یہ اگلے شمارے میں شائع کیا جا سکے۔

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق

''ایوان جمہور'' 107 - ٹیپو بلاک،

نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور

جہدحق کا تازہ شمارہ اور پچھلے شمارے ویب سائٹ پر موجود ہیں۔ پتہ:

www.hrcp-web.org

انتہا پسندی کی جڑیں

آئی۔اے۔رحمان

مذہبی انتہا پسندی کے حامیوں کے تعداد اچھی خاصی ہے جو مذہبی انتہا پسندی پر تنقید سے متاثر نہیں ہوتے اور یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ انتہا پسندی کی واحد شکل نہیں ہے۔ یہ نکتہ درست ہے اگر چہ ایمان اور عقائد پر مبنی عدم برداشت کو الگ رکھ کر بھی سمجھنے کی کوشش کرنے پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ لیکن ایک مختصر جائزہ یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ انتہا پسندی کی مختلف شکلوں کی جڑیں ایک ہی ہیں۔

پاکستان کے ماحول کو سامنے رکھتے ہوئے شدت پسندی کی ایک تعریف یہ کی جاسکتی ہے کہ یہ دوسرے لوگوں کے طبقات، مذہب، ثقافت، روایات کے خلاف کبھی نہ ختم ہونے والی نفرت، اقلیتی برادریوں اور خواتین کے حقوق کی مخالفت، اُنہیں بزور طاقت اور تشدد اور کبھی کبھار دہشت گرد حملوں کے ذریعے جھکنے پر مجبور کرنے کا نام ہے۔ پاکستان میں شدت پسندی کا شکار ہونے والوں میں سب سے زیادہ تعداد خواتین کی ہے۔ محکمہ شماریات اور پنجاب کمیشن برائے حقوقِ نسواں کے تعاون سے اقوامِ متحدہ آبادی فنڈ کے سروے کی ایک حالیہ رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ پنجاب میں عورتوں کی ایک تہائی تعداد جن کی عمر 15 سے 64 سال تک ہے تشدد کا نشانہ بنی ہے۔ ملک کے دوسرے حصوں میں بھی کم وبیش یہی صورتحال ہے۔

تقریباً ہر روز، میڈیا کسی خاتون کے جلائے جانے یا مارے جانے کی رپورٹ دیتا ہے۔ مرد کی عزت کی خاطر عورتوں کو مارنے کی روایت ایسے علاقوں تک پھیل گئی ہے جہاں کسی کو ان چیزوں کا علم بھی نہیں تھا۔ عورتوں پر اپنی پسند کی شادی، جہیز کے مطالبات پورے کرنے میں ناکام ہونے پر اور نامناسب لباس پہن کر باہر جانے اور ہیئر سٹائل بنانے جیسے عجیب وغریب بہانے بنا کر حملے کیے جاتے ہیں۔ ایسے علاقے بھی ہیں جہاں بچیوں کو سکول جانے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ مزدور خاندانوں، زراعت میں یا اینٹ کی بھٹیوں یا دوسرے مختلف شعبوں میں کام کرنے والے خاندانوں کی عورتوں اور بچیوں پر کئی طرح کی زیادتیاں کی جاتی ہیں۔ اُن کی مزدوری کا استحصال کیا جاتا ہے، اُنہیں کہیں جانے کی آزادی نہیں دی جاتی، وہ مُتبادل ملازمت حاصل نہیں کرسکتیں، اور اُنہیں اغوا اور جنسی زیادتیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

مسلمان خواتین کی نسبت غیر مسلم عورتوں اور بچیوں کو زیادہ تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے، اور جو شہری اب ریاست کی طرف سے شیڈول کاسٹ ذاتوں کے طور پر شناخت کیے جاتے ہیں، وہ اعلیٰ ذات کے ہندوؤں اور دیگر غیر مسلم گروہوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ تشدد کا شکار بنتے ہیں۔

اوپر بیان کیے گئے درجے کے علاوہ ایک اور بڑا گروہ انتہا پسندی کے تشدد سے متاثر ہوتا ہے۔ لاوارث بچوں کی ایک بڑی تعداد معاشی استحصال اور جسمانی اور جنسی زیادتی کا شکار ہوتی ہے۔ گھریلو ملازمین کی تعداد جس مختلف اقسام کی زیادتیوں کا نشانہ بنتے ہیں کچھ عرصے سے بڑھ رہی ہے۔ ریاست سکولوں میں جسمانی سزا کو ختم کرنے میں ناکام رہی ہے۔ ایک دن ایک چھوٹی بچی چھت سے گرنے (یا کودنے) کے بعد مرگئی۔ وہ سکول سے چھٹکارا چاہتی تھی جہاں اُسے پڑھائی میں پیچھے رہنے

پاکستان کے ماحول کو سامنے رکھتے ہوئے شدت پسندی کی ایک تعریف یہ کی جاسکتی ہے کہ یہ دوسرے لوگوں کے طبقات، مذہب، ثقافت، روایات کے خلاف کبھی نہ ختم ہونے والی نفرت، اقلیتی برادریوں اور خواتین کے حقوق کی مخالفت، انہیں بزور طاقت اور تشدد اور کبھی کبھار دہشت گرد حملوں کے ذریعے جھکنے پر مجبور کرنے کا نام ہے۔

کی وجہ سے بے رحمی سے مارا جاتا تھا۔ اُس کی ماں نے اُس کی قابلِ رحم حالت میں اُس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اُسے ایک اندھیرے کمرے میں پھینک کر اُس کی اذیت میں اضافہ کیا۔ زبردستی اغوا انتہا پسندی کی بدترین شکلوں میں سے ایک ہے۔

اب ہمیں مذہب پر مبنی انتہا پسندی کے معاملے پر ایک نظر دوڑانی چاہیے۔ ہزارہ کے شیعوں کو اُن کے عقائد کی وجہ سے کاٹ دیا گیا۔ کئی نفرت کے مبلغ کھُلے عام قتل و غارت کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ احمدی لگاتار ٹارگٹ کلنگ کا شکار ہوتے ہیں۔ اقلیت مخالف لوگ مذہب کی توہین کے واقعات کا فیصلہ عدالت میں ہونے دینے کے حامی نہیں ہیں۔ وہ گلیوں اور تھانوں کے اندر ہی ملزم کو قتل کر دینا چاہتے ہیں۔ اگر توہینِ مذہب کا کوئی ملزم بری بھی ہو جائے تو اُسے بھی ملک میں کہیں رہنے کی جگہ نہیں ملتی۔

اِس میں بھی کوئی شک نہیں کہ غیر مسلموں کو اُن کی عبادت گاہوں میں اور مسلمانوں کو مساجد اور سکولوں میں مذہب کے نام پر قتل کر دیا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ انتہا پسندوں کے تشدد کے شواہد کا ایک سرسری مطالعہ اس حقیقت کو سامنے لائے گا کہ شدت پسندی مذہب سے تعلق نہ رکھنے والے معاملات میں بھی بہت زیادہ شدت سے موجود ہے جیسا کہ مزدوروں کا استحصال، بے گھر بچوں پر تشدد اور اُن کا استحصال، سکولوں اور مدرسوں میں بچوں پر جسمانی سزا کے ضمن میں انتہائی درجہ کا تشدد جیسے واقعات پاکستان میں آئے روز ہوتے ہیں۔

عورتوں کے خلاف تشدد کے اسباب میں پدرانہ معاشرہ، جاگیردارانہ ثقافت، خواتین کے خلاف نفرت آمیز رویے کے علاوہ مذہبی تعلیمات کی غلط تشریح بھی شامل ہے۔ جہاں تک انتہا پسندوں اور باغیوں کے مذہب کے نام پر دہشت گردی کے بیانیے کا تعلق ہے، ایک بین الاقوامی سطح پر شہرت رکھنے والے سکالر، اسلامی نظریاتی کونسل کے سابق چیئرمین اور وفاقی شرعی عدالت کے سابق جج ڈاکٹر خالد مسعود کے مطابق یہ بیانیہ مذہب کی غلط تشریح پر مبنی ہے۔ بدقسمتی سے شدت پسندی کی تمام شکلوں کی جڑیں ریاست کی کوتاہیوں اور غلطیوں سے جڑی ہیں۔ اگر پدرانہ نظام، خواتین سے نفرت اور جاگیردارانہ نظام کی وجہ سے خواتین کی مشکلات میں اضافہ ہوا ہے تو اِس کی ذمہ دار ریاست ہے جس نے پاکستانی معاشرے کو ایسی دقیانوسی اقدار سے پاک نہیں کیا جو جمہوری نظام اور ثقافت کی مضبوطی کے راستے کی رکاوٹ ہیں۔ اگر سکول اور مدرسہ میں بچے اساتذہ کے بھیس میں چھپے درندوں کے رحم و کرم پر ہیں اور اگر بڑے تعلیمی اداروں کے لوگ مشال خان جیسے طلبا اور خالد حمید جیسے استاد کو قتل کر سکتے ہیں تو کیا ریاست اِن معاملات سے لاتعلق رہ کر قائم رہ سکتی ہے؟

مزدور، اُن کے گھر کی خواتین اور بچے پریشانی کا شکار رہتے ہیں کیونکہ اُن پر ظلم ڈھالنے والے اپنے سیاسی مقاصد کی تکمیل میں پھنسے رہتے ہیں۔ کیا ریاست نے متعلقہ آئی ایل او کنونشن پر دستخط کرنے کے باوجود بچوں کی مشقت کے خاتمہ کے لیے کوئی کاروائی کی؟ کیا ریاست نے جبری گمشدگیوں جو کہ شدت پسندی کی بدترین شکل ہے، کو نظر انداز کرنے کی روش ختم کی؟ جہاں تک مذہب کے نام پر شدت پسندی کا تعلق ہے، ریاست کو غفلت اور مجرمانہ کوتاہی دونوں لحاظ سے سخت سبکی کا سامنا رہا ہے۔ ایک طرف تو اِس نے لوگوں کو اپنے عقائد کی صحیح تر جمانی سے روشناس کرنے کے لیے کوئی اہم قدم نہیں اٹھایا تو دوسری طرف یہ اُنہی مذہبی جماعتوں کے قریب ہے جو جمہوریت، انسانی حقوق اور تنوع کے سخت خلاف ہیں۔ پچھلی تمام حکومتوں نے مذہبی لابی کو خوش کرنے کے لیے لوگوں کو تقسیم کیا۔ اب وقت ہے کہ حالیہ حکومت خود سے پوچھے کہ اِس نے پچھلی حکومتوں کے مقابلے میں مذہبی شدت پسندی سے نمٹنے کے لیے کس حد تک کردار ادا کیا ہے کیونکہ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس نے صدیوں سے اسلام اور مسلمانوں کو بے انتہا نقصان پہنچایا ہے۔

(انگریزی سے ترجمہ، بشکریہ ڈان)

مذہب کی جبری تبدیلی اور اس کی روک تھام کے لئے ضروری اقدامات کا جائزہ

پیٹر جیکب

21 نومبر 2019ء کو پاکستان کے چیئرمین سینٹ اور سپیکر قومی اسمبلی نے اقلیتوں کو جبری تبدیلی مذہب سے تحفظ کی غرض سے ایک مشترکہ پارلیمانی کمیٹی تشکیل دی۔ کمیٹی میں مختلف سیاسی جماعتوں کے 22 اراکین (سینٹ اور قومی اسمبلی) بشمول آٹھ ہندو اور مسیحی شامل ہیں۔ توقع کی جاتی ہے کہ کمیٹی کی تشکیل ایسے اقدامات کا پیشہ خیمہ ثابت ہوگی جس سے مذہبی اقلیتوں کے جان و مال اور وقار کو تحفظ مل سکے اور ان کے احساسِ محرومی کا ازالہ کیا جا سکے۔

یہ ضروری ہوگا کہ کمیٹی معلومات پر مبنی جائزہ، غیر جانبدارانہ تحقیقات اور متاثرین، نیز سول سوسائٹی اور میڈیا کی تحقیقات سے استفادہ کرے کیونکہ مذہب کی جبری تبدیلی کے موضوع کے حوالہ سے کچھ فکری، قانونی اور عملی پیچیدگیاں درپیش ہیں جن کا احاطہ باقی ہے۔ بادی النظر میں جبری تبدیلی مذہب ہمارے سماج میں پائے جانے والے قانون شکنی کے کلچر کا ایک علامتی اظہار ہے لیکن مرض کی علامت کی بجائے اس کی وجہ سے نمٹنا ضروری ہے۔

اس ورکنگ پیپر کے ذریعے ادارہ برائے سماجی انصاف اور پیپلز کمیشن فار مینارٹی رائٹس سول سوسائٹی کے تجربات کی روشنی میں اپنی رائے پیش کر رہا ہے تا کہ اس موضوع پر مکالمہ کو زیادہ بامعنی بنانے میں اپنا حصہ ڈالا جا سکے۔

جبری تبدیلی مذہب کسے کہتے ہیں؟

دنیا میں عقیدے کی ایسی تبدیلی جس کے پیچھے کوئی جبر یا دباؤ کارفرما ہو اس کو کئی ناموں سے لیا جاتا ہے۔ کہیں اس کو غیر اخلاقی تو کہیں اس کو غیر رضا کارانہ تبدیلی مذہب کہا جاتا ہے۔ سامنے آنے والی مثالوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس تبدیلی مذہب کے ساتھ متاثر شخص یا اشخاص کی کسی اضافی مجبوری یا کمزوری کا عمل دخل ہوتا ہے مثلاً صنف، عمر (بچہ) یا سیاسی اور سماجی حیثیت۔

اقوامِ متحدہ میں مذہب اور عقیدے کی آزادی کے حوالے سے تعینات خصوصی مُبصر محترمہ عاصمہ جہانگیر نے 2005ء میں جنرل اسمبلی کو اپنی رپورٹ میں لکھا:

''خصوصی مبصر اس بات کا اعادہ کرنا چاہتی ہے کہ ریاست اپنے علاقے میں بسنے والے لوگوں بشمول اقلیتوں کے لیے عقیدے پر آزادانہ عمل کرنے کا تحفظ دینے کی پابند ہے۔ اگر کوئی غیر ریاستی عناصر ان کی آزادی میں مداخلت کریں (خصوصاً اپنے عقیدے پر عمل پیرا ہونے کی) تو ان عناصر کو انصاف کے کٹہرے میں لایا جائے اور متاثرین کی دادرسی اور بحالی کے اقدامات کئے جائیں''۔

معاہدے کے آرٹیکل 18 کے پیراگراف 4 کے مطابق (حوالہ: شہری اور سیاسی حقوق کا عالمی میثاق)

''آخر میں، میں بطورِ خصوصی مُبصر بچوں کے حوالے سے یہ باور کرانا چاہتی ہوں کہ بچوں کا حقِ آزادی عقیدہ والدین کے حق کے ساتھ مشروط ہے تاوقتیکہ بچے ایک خاص عمر میں اس سطح پر پہنچ جائیں جہاں وہ اپنی مرضی سے اس حق کا استعمال کر سکتے ہیں''۔

پاکستان کے سیاسی وسماجی میں اگر مندرجہ ذیل عناصر اور حقائق موجود ہوں تو اسے جبری تبدیلی مذہب تصور کیا جائے گا۔

1۔ اگر مذہب تبدیل کرنے والا/والی کمسن، خاندانی معاشی یا سماجی اعتبار سے زیرِ کفالت ہے یا کسی ذہنی یا جسمانی معذوری کا شکار ہے۔

2۔ اگر تبدیلی مذہب اکثریتی مذہب یا فرقہ میں فوری نکاح سے منسلک ہو۔

3۔ اگر مذہب تبدیل کرنے والے شخص کو اپنے خاندان یا سرپرست سے جدا کر کے رکھا جائے۔

4۔ اگر ملزم قانونی کاروائی (تفتیش یا انکوائری) سے فرار، اس میں مداخلت یا اس پر ناجائز اثر یا دباؤ ڈالنے کی کوشش کرے۔ عدالتی کاروائی کے وقت غیر حاضر رہے، مجمع اکٹھا کرلے، عدالتی حدود سے فرار کے ذریعے یا متاثرہ خاندان کے اوپر الزام تراشی کر کے مثلاً جان کو خطرہ یا جعلی اور جھوٹ پر مبنی سرٹیفکیٹ یا اقرار نامہ پیش کرے یا یونین کونسل، سکول، چرچ یا ندرا کے ریکارڈ میں خود سے تبدیلی کرنے کا مرتکب ہو۔

5۔ اگر عدالتی انکوائری میں میرج سرٹیفکیٹ یا عمر کا تعین کرنے والی دستاویزات اور ان کی تحقیقات اور شہادتوں نیز ملزم کے کردار کی انکوائری جیسے پہلوؤں کو نظر انداز کیا گیا ہو۔

6۔ اگر عدالتی کاروائی میں نکاح کا دعویٰ کرنے والے فریقین کی ازدواجی حیثیت نیز پہلے سے شادی شدہ ہونے کی صورت میں پہلی بیوی سے اجازت کے بارے میں سوالات نہ کیے گئے ہوں یا اُن کے بارے میں کوئی جھوٹ بولا گیا ہو۔

7۔ اگر تبدیلی مذہب بار بار کی دعوت، اصرار یا مادی فوائد کے لالچ کے نتیجے میں ہو۔ علاوہ ازیں، جس میں ہراساں یا بلیک میل کرنے جیسے عوامل کارفرما ہوں۔

معاملے کی سنگینی اور وسعت:

پاکستان میں، خصوصاً صوبہ سندھ اور پنجاب کی اقلیتی خواتین کی تبدیلی مذہب کی خبریں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ ذیل میں کچھ تنظیموں کی طرف سے جمع کئے گئے اعداد و شمار اس مسئلہ کی وسعت کا اندازہ کرنے میں مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔

نیشنل (کاتھولک) کمیشن برائے امن و انصاف کے مطابق 2000 سے 2012 تک 1733 افراد نے مذہب تبدیل کیا۔ جن میں عورتیں، مرد اور بچے شامل تھے۔ 726 کا تعلق ہندو، 605 مسیحی، 384 احمدی، 3 سکھ اور 3 کیلاش مذہب سے تعلق رکھتے تھے جبکہ رپورٹ میں 13 افراد کے مذہبی پس منظر کو ظاہر نہیں کیا گیا۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ذرائع ابلاغ میں شائع ہونے والے تمام واقعات میں اقلیتی افراد نے اکثریتی مذہب اختیار کیا تھا۔

ایک اور تحقیقاتی رپورٹ کے مطابق 2011-2009 کے دوران مالی پریشانیوں اور عدم تحفظ کی وجہ سے لاہور اور گردونواح میں ہر ماہ اوسطً 60 مسیحی افراد مذہب اسلام اختیار کر رہے تھے۔

یونیورسٹی آف برمنگھم کے ایک تحقیقی مکالہ کے مطابق، جنوری 2012 سے جون 2017 کے درمیان پاکستان میں اقلیتی عورتوں اور لڑکیوں کی تبدیلی مذہب کے 2866 واقعات منظر عام پر آئے۔

2018ء کے دوران، نیشنل کمیشن فار ہیومن رائٹس کو اقلیتوں کے حقوق کی پامالی کی 30 شکایات موصول ہوئیں جن میں سے کئی شکایات کا تعلق جبری تبدیلی مذہب سے تھا۔

مارچ 2019ء میں دو بہنوں رینا اور روینا کے تبدیلی مذہب اور نکاح کے واقعات جبری تبدیلی مذہب کے طریقے کار کو سمجھنے میں معاونت کر سکتے ہیں۔ رینا اور روینا کو ڈھرکی (سندھ) کی بجائے، رحیم یار خان (پنجاب) کی ایک عدالت میں پیش کیا گیا تا کہ ان کے والدین مقدمے کی پیروی نہ کر سکیں۔ پھر ملزمان نے اسلام ہائی کورٹ میں درخواست دی کہ انہیں رینا اور روینا کے والدین سے جان کا خطرہ ہے۔ یوں عدالتی کاروائی نیز مبینہ طور پر اغواء شدہ لڑکیوں پر ذہنی دباؤ کا استعمال کیا گیا تا کہ ملزمان قانون کی نظر میں معصوم رہیں۔ عدالت اور حکومت نے ان میڈیا رپورٹس کو نظر انداز کیا جن میں یہ واضح کیا گیا تھا کہ اس کیس میں بھی میاں عبدالخالق عرف میاں مٹھو کا ہاتھ ہے۔ یہ سابق ایم این اے ایسے بہت سے تبدیلی مذہب کے واقعات میں ملوث ہونے کی شہرت رکھتا ہے۔ میاں مٹھو کی ڈھرکی کی ایک درگاہ سے وابستگی اس کی طاقت کا سرچشمہ ہے۔

پیپلز کمیشن فار مینارٹی رائٹس اور ادارہ برائے سماجی انصاف نے 2013ء سے 2019ء کے درمیان سامنے آنے والے 159 واقعات کا ڈیٹا جمع کیا جس سے جبری تبدیلی مذہب کے مسئلے اور اس میں پائے جانے والے رجحانات کو سمجھنے میں مدد لی جا سکتی ہے۔ مزید برآں 16 خواتین کے کیس جو ماضی میں جبری تبدیلی مذہب اور نکاح کے مرحلے سے گزر چکی ہیں اور ان کے کیس سندھ ہائی کورٹ میں زیرالتوا ہیں۔ اُن کا مطالعہ مسئلے سے جڑی پیچیدگیوں

سے واقفیت کا ذریعہ ثابت ہوسکتا ہے۔

پیپلز کمیشن فار مینارٹی رائٹس نے مئی 2019ء کو لاہور میں اس مسئلہ پر ایک عوامی انکوائری کا انعقاد کیا جس میں جبری تبدیلی کے علاوہ چینی باشندوں سے اقلیتی لڑکیوں کے نکاح کا مسئلہ بھی زیرِ بحث آیا۔ اس انکوائری میں ہائی کورٹ کے دو سابق جج صاحبان، چیئر پرسن این سی ایس ڈبلیو (NCSW) اور سینئر وکلا جیوری کا حصہ تھے جس کی سربراہی محترمہ حنا جیلانی نے کی۔

جبری تبدیلی مذہب اور اِس سے جڑے جرائم:

بسا اوقات جبری تبدیلی مذہب سے پہلے لڑکیوں کو اغواء کیا جاتا ہے پھر مسلسل جسمانی و ذہنی دباؤ میں رکھا جاتا ہے۔ لڑکیوں کو ان سے یا ان کے اہل خانہ کے خلاف تشدد یا تشدد کی دھمکی کو ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ لڑکی جو بالعموم نابالغ، ناخواندہ یا نیم خواندہ اور اغواء شدہ ہوتی ہے اس سے تبدیلی مذہب کے اقرار نامے پر دستخط کروائے جاتے ہیں اور پھر اغواء کرنے والے نکاح نامہ بھی تیار کر لیتے ہیں۔ کئی واقعات میں زنا بالجبر پہلے ہوتا ہے جبکہ دیگر کارروائی بعد میں شروع ہوتی ہے۔ جس کے بعد لڑکی اپنے آپ کو بے بس سمجھتی ہے۔ لڑکی کا رابطہ کیونکہ اپنے خاندان سے کٹ چکا ہوتا ہے لہذا اُن کے متعلق بدگمانیاں پیدا کی جاتی ہیں۔ خاندان جب ایف آئی آر کٹواتے ہیں تو ملزمان جو بالعموم لڑکی کے خاندان کے جاننے والے ہوتے ہیں، قانونی کارروائی کو لڑکی کو مزید دباؤ میں لانے کے لیے استعمال کرتے ہیں کہ لڑکی کے خاندان نے اس کے خلاف درخواست دی ہے۔ نکاح نامہ بنانے کے ساتھ ہی ملزمان کے تمام جرائم پر قانون کی گرفت ڈھیلی پڑ جاتی ہے۔

اپریل 2019ء میں لاہور ہائی کورٹ میں ایک چودہ سالہ مسیحی لڑکی شارلٹ جاوید کو والدین کی درخواست پر گھر جانے کی اجازت دے دی گئی جسے 20 فروری 2019ء کو ظفر نامی ایک مسلمان ہمسائے نے اغوا کر کے تبدیلی مذہب کا سرٹیفکیٹ پیش کر دیا تھا۔ جب فیصل آباد کی پولیس نے شارلٹ کو عدالت میں پیش کیا تو اس نے بتایا کہ اسے بیچا گیا، زبردستی اس کا مذہب تبدیل کیا گیا اور اس کا نکاح کیا گیا۔ کی بالعموم اقلیتی برادریوں کے افراد مالی طور پر انصاف تک رسائی کرنے کے متحمل نہیں ہوتے نہ ہی نظامِ انصاف جبری تبدیلی مذہب پر اُن کی شکایت کی چھان بین میں دلچسپی کا مظاہرہ کرتا ہے۔

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق کی 2014ء کی رپورٹ اس مسئلہ کو کچھ یوں بیان کرتی ہے کہ ''پولیس عام طور پر اغواء اور جبری تبدیلی مذہب کی شکایات سے چشم پوشی کرتی ہے۔ جس سے ان حقوق کی پامالی کرنے والوں کو کھلی چھوٹ مل جاتی ہے۔ پولیس عام طور پر ایف آئی آر درج کرنے سے انکار کر دیتی ہے یا پھر جھوٹی ایف آئی آر درج کرتی ہے جس سے متاثرہ خاتون کے خاندان کے لیے کیس پر پیش رفت کرنا مشکل ہو جاتی ہے۔

زیریں اور اعلیٰ عدالتوں میں ایسے کیسوں میں ضابطے کے مطابق کارروائی کے ضمن میں کمزوری کا مظاہرہ کیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ اغوا کار مذہبی جماعتوں کو ساتھ لے کر ججوں کو دھمکانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں نیز عدالتی عملہ اپنے مذہبی تعصّبات سے مغلوب ہو کر دائرہ اسلام میں آزاد مرضی سے داخل ہونے کی کہانی کو باآسانی قبول کر لیتے ہیں۔

بعض مسلمانوں کا خیال ہے کہ دائرہ اسلام میں داخل کرنا ہر حال میں کارِ ثواب ہے اس لیے ریاستی مشینری میں بیٹھے لوگ بالخصوص پولیس اغوا کاروں یا ملزموں کے خلاف کارروائی کرنے میں تامل کا مظاہرہ کرتی ہے۔ بعض مخیّر حضرات اور مذہبی شخصیات بھی اس کو کارِ خیر سمجھ کر حصہ لیتے ہیں۔

مندرجہ بالا حقائق سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اغوا اور جبری تبدیلی مذہب کے واقعات ایک سنگین مسئلہ کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ متاثرہ خاندانوں کے بیان کردہ حقائق، میڈیا رپورٹس اور بعض عدالتی احکامات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اقلیتی لڑکیوں اور خواتین کو بہ حیثیت سماجی گروہ ایک منظّم انسانی حقوق کی پامالی کا مسلسل سامنا کرنا پڑتا ہے۔

مزید برآں یہ امر کہ جبری تبدیلی مذہب تاحال پاکستان کے قانون میں جرم قرار نہیں دیا گیا اس لیے متاثرہ خاندان اغواء وغیرہ کی دفعات کے تحت شکایات درج کرواتے ہیں جبکہ تفتیش بالعموم پولیس کی غفلت کا شکار ہو جاتی ہے۔

کوئی فریادی غریب اقلیتی برادری سے تعلق رکھتا ہو تو اس غفلت کے امکانات کچھ زیادہ ہی ہوتے ہیں۔ لڑکی کی عمر کا تعین نہیں کیا جاتا اور لڑکی کو ملزمان کے قبضے میں رہنے دیا جاتا ہے۔ اسی لیے عدالتی کارروائی کے دوران اس پر ذہنی دباؤ ڈالنا آسان ہوتا ہے تاوقتیکہ وہ عدالت میں اپنی رضامندی سے نکاح اور تبدیلی مذہب کا بیان نہ دے دے۔

تبدیلی مذہب کی سند:

کئی مساجد اور مدارس متواتر قبولِ اسلام کی اسناد جاری کرتے ہیں۔ یہ اقدام قانون سے ماوراء ہے۔ مذہبی جذبات سے مرعوب مندرجہ بالا ادارے اس بات سے صرف نظر کرتے ہیں کہ اس تبدیلی میں جبر کا پہلو ہو سکتا ہے۔ بعض لوگ دائرہ اسلام میں مذہبی اقلیتوں کے داخل کرنے کو مذہبی فریضہ جان کر اس کے لیے مالی سخاوت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

قانون اور اصلاحات کی کوشش:

آئینِ پاکستان اکثر مسلمہ بین الاقوامی انسانی حقوق کو تحفظ دیتا ہے۔ بالخصوص آرٹیکل 20 آزادانہ عقیدہ رکھنے، اس پر عمل اور اس کی تشہیر کرنے کی آزادی کی ضمانت دیتا ہے۔ مگر ان حقوق کی پامالیاں بھی روزمرہ کا معمول اور تشویش کا باعث ہے۔ پاکستان کے قانون میں کوئی مذہب ترک یا اختیار کرنے پر کوئی پابندی نہیں لیکن عملی اعتبار سے، صرف اقلیتی عقیدہ کے لوگ نیا عقیدہ اختیار کر سکتے ہیں جبکہ کسی مسلمان کا کوئی دوسرا عقیدہ اختیار کرنا ارتداد سمجھا جاتا ہے جو کہ کچھ لوگوں کے نزدیک قابلِ گردن زنی ہے۔

اس کے باوجود بہت سے جرائم جو تبدیلی مذہب کی آڑ میں کیے جاتے ہیں ان سے نمٹنے کے لیے قانون کا دامن وسیع ہے مثلاً بچوں اور عورتوں کا اغواء، جنسی و صنفی جرائم، جبری اور کمسنی کا نکاح اس کے علاوہ کسی کے مذہبی جذبات کو ٹھیس پہنچانا یہ سب قابلِ سزا جرائم ہیں مگر تبدیلی مذہب کی آڑ میں ان تمام جرائم پر پردہ پڑ جاتا ہے۔ متاثرہ لڑکیوں اور عورتوں کی اکثریت ان جرائم سے محفوظ رہنے کی انفرادی صلاحیت سے محروم ہے۔

الف۔ فوجداری قانون میں ترمیم 2017:

2017ء میں برسلز (بیلجیم) میں ایک اجلاس ہو رہا تھا جس میں پاکستان کو دی گئی تجارتی مراعات کے معاہدے، جے ایس پی پلس کا جائزہ لیا جانا تھا۔ لہذا اس اجلاس سے چند ہفتے پیشتر تعزیراتِ پاکستان نے ایک ترمیمی بل قومی اسمبلی میں منظور کیا جس کے تحت تعزیراتِ پاکستان قانون میں دفعہ 498۔ب کا اضافہ ہونا تھا جس میں کسی کمسن اور غیر مسلم خاتون سے جبراً نکاح کو جرم قرار دیا گیا تھا اور جرم کی سزا 10 سال قید کم سے کم پانچ سال اور 5 لاکھ روپے جرمانہ رکھی گئی تھی۔ بہرحال اس بل کو سینٹ کی منظوری نہیں مل سکی اور تاحال یہ قانون منظور نہیں ہوا۔

ب۔ پروٹیکشن آف مینارٹی بل سندھ 2005:

فروری 2013 میں حکومتِ سندھ نے تین ارکان پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی جس کا مقصد ایسی قانون سازی تجویز کرنا تھا جن سے جبری تبدیلی مذہب اور نکاح کا تدارک ہو سکے۔ نتیجتاً ایک مسودہ قانون تیار ہوا۔ جس میں عدالتی کارروائی کے لیے ہدایات اور متاثرہ خواتین کے لیے انصاف تک رسائی کے طریقہ کار کو وضع کیا گیا تھا۔

یہ بل نومبر 2019ء کو سندھ اسمبلی میں اتفاق رائے سے منظور کر دیا گیا جبکہ مذہبی جماعتوں نے اس کی مخالفت کی کیونکہ قانون میں تبدیلی مذہب کے لیے بلوغت کی شرط 18 سال رکھی گئی ہے جس پر انہیں اعتراض تھا۔ جماعتوں نے یہ بھی دھمکی دی کہ وہ سندھ اسمبلی کا گھیراؤ کریں گے جس کے بعد گورنر سعید الزماں صدیقی نے بل کی منظوری دینے سے انکار کر دیا۔

2019ء میں اِسی بل کی ایک ترمیمی شکل کو اسمبلی کے ایک ہندو رکن نند کمار نے دوبارہ پیش کیا تو مذہبی جماعتوں کے ساتھ ساتھ کچھ سیاسی جماعتوں نے بھی بل کی مخالفت کرنا شروع کر دی۔ میاں مٹھو نے بھی احتجاج کا اعلان کیا جس کے بعد حکومت کو اس بل پر پیش رفت کی توفیق نہیں ہوئی۔

اسی سال متذکرہ بالا رینا روینا کیس کے بعد قومی اسمبلی اور پنجاب اسمبلی میں چند پرائیویٹ بل پیش کیے گئے جو بے نتیجہ رہے۔

لہذا یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ جبری تبدیلی مذہب کو روکنے کے لیے کوئی مناسب قانون موجود نہیں نیز قانون سازی کے ذریعے

اس رجحان کے آگے بندھ باندھنے کی متعدد کوششیں ہوئیں لیکن تاحال کوئی کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوا۔

بین الاقوامی ذمہ داریاں: حقوق کا تحفظ

اقوامِ متحدہ کے اداروں کی طرف سے پاکستان کی حکومت کو بین الاقوامی قانون کے تحت اس کی ذمہ داریوں اور جبری تبدیلی مذہب کے ضمن میں ہونے والی انسانی حقوق کی سنگین خلاف ورزیوں کی بار بار یاد دہانی کروائی گئی ہے۔

1۔ 2013ء میں عورتوں کے خلاف ہر قسم کے امتیاز کے خاتمے کے معاہدے (CEDAW) کی نگران کمیٹی نے اپنی حتمی سفارشات میں لکھا:

''کمیٹی کمسنی میں اقلیتی لڑکیوں اور خواتین کے اغواء اور جبری نکاح کے واقعات پر اپنی تشویش کا اظہار کرتی ہے۔ نیز یہ بھی قابلِ اعتراض ہے کہ لڑکیوں کے لیے کم سے کم عمر 16 سال رکھی گئی ہے (پیراگراف 379)

کمیٹی سیڈا کنونشن کے آرٹیکل 16 کے تحت سفارش کرتی ہے کہ

الف۔ ہندو میرج بل اور کرسچن میرج اینڈ ڈیوس ترمیمی بل پاس کیا جائے۔

ب۔ جبری تبدیلی مذہب اور نکاح کے رجحان کی مکمل تحقیق کر کے ایک جامع حکمت عملی تیار کی جائے تا کہ ایسے تمام واقعات کی مؤثر تفتیش اور عدالتی کارروائی کر کے مجرموں کی سزا کو یقینی بنایا جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ جبری نکاح اور تبدیلی مذہب سے متاثرہ لوگوں کو دادرسی اور بحالی کی سہولیات فراہم کی جائیں۔

2۔ نسلی امتیاز کے بین الاقوامی معاہدے کی نگران کمیٹی نے پاکستان کی صورتحال کا جائزہ لیتے ہوئے 2016ء میں اس مسئلہ پر مندرجہ ذیل سفارشات دیں۔

''کمیٹی دلت (شیڈول کاسٹ) خواتین اور لڑکیوں کے تبدیلی مذہب اور نکاح کے مقصد کے تحت اغوا کی وارداتوں پر اپنی تشویش کا اظہار کرتی ہے۔ کمیٹی اس بات پر افسوس کا اظہار کرتی ہے کہ سرکاری (پاکستان) رپورٹ میں اس مسئلہ پر تفصیلاً معلومات فراہم نہیں کی گئیں'' (پیراگراف 31)

''2002ء میں جاری کردہ عمومی سفارشات نمبر 29 بحوالہ CERD معاہدے کے آرٹیکل 1(1) کو یاد کرتے ہوئے حکومت پاکستان سے سفارش کرتی ہے کہ وہ مسیحی، ہندو اور دلت (شیڈول کاسٹ) خواتین کی جبری تبدیلی مذہب اور نکاح کے واقعات پر فی الفور سخت قانونی کارروائی اور اغوا کار مجرموں کے خلاف سزا کو یقینی بنائے،،۔

3۔ 2016ء میں بچوں کے حقوق کے معاہدے کی نگران کمیٹی نے جبری نکاح اور تبدیلی مذہب کے متعلق یہ سفارشات دیں (پیراگراف 58)

کمیٹی یہ سفارش کرتی ہے کہ ریاست کسی بھی شخص کی مرضی کے برخلاف عقیدے کے جبری تبدیلی پر پابندی عائد کرے۔

4- 2017ء میں معاشی، سماجی اور ثقافتی حقوق کے بین الاقوامی میثاق کی نگران کمیٹی نے مندرجہ ذیل تبصرہ اور سفارشات پیش کیں۔ (CESCR) کمیٹی کو یہ تشویش ہے کہ شیعہ مسلم بچوں کو تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا ہے نیز مذہبی اقلیتوں مثلاً ہندو اور مسیحی بچوں کو جبری تبدیلی مذہب مجبور کیا جا رہا ہے۔

5- 13 نومبر 2017 کو عالمی معیاری جائزے (UPR) میں مندرجہ ذیل سفارشات منظور کی گئیں۔ (152.169)

''ہندو، سکھ اور مسیحی عورتوں کے جبری نکاح اور تبدیلی مذہب کا خاتمہ کیا جائے اور ملزمان کے خلاف عدالتی کارروائی کی جائے۔ کمسنی کے نکاح اور جبری تبدیلی مذہب کچ خاتے اور عورتوں کے سماجی، سیاسی اور معاشی حقوق اور ترقی کے لیے قانون بنایا اور نافذ کیا جائے۔'' (152.275)

6- اقوامِ متحدہ میں انسانی حقوق کے ہائی کمشنر زید راعد الحسین نے 13 اپریل 2018 کو وزارتِ خارجہ کو اپنے ایک خط میں کہا کہ ''مذہب اور عقیدے کی مکمل ضمانت دی جائے۔ مذہبی اقلیتوں کا تحفظ کیا جائے، احمدیوں سمیت مذہبی اقلیتوں کے مخالف اور تکفیری قوانین کا خاتمہ کیا جائے، اقلیتی خواتین کا جبری نکاح اور تبدیلی مذہب کا خاتمہ کیا جائے۔''

حاصلِ بحث اور سفارشات:

جبری تبدیلی مذہب کا زیادہ تر شکار اقلیتی خواتین بنتی ہیں۔ یہ جرم دیگر جرائم پر پردہ پوشی کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے جس میں جسمانی اور جنسی تشدد، مذہبی امتیاز، اغوا، ریپ اور بالخصوص مذہبی آزادیوں سے متعلق دیگر جرائم شامل ہیں۔ عقیدے کی تبدیلی کی آڑ میں کیے گئے جرائم حقوق کی سنگین خلاف ورزی ہے۔ چند واقعات میں جہاں حقیقت کا پردہ چاک ہوا ہے وہ ان سنگین خلاف ورزیوں کی بعین مثال ہیں۔

مذہبی اقلیتوں کی شکایات میں وزن ہے جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ رپورٹ ہونے والے بیشتر واقعات جبر کا نتیجہ ہیں جن کو عدالت میں حالیہ قوانین کے تحت ثابت کرنا مشکل ہے۔ مجرموں کو میسر اس کھلی چھوٹ کے پیچھے ملک میں پھیلی لاقانونیت اور مذہبی امتیاز کا ہاتھ ہے۔ حقوق کی یہ پامالیاں مذہبی اقلیتوں میں دُکھ، مایوسی اور غصے کو جنم دیتی ہیں جن سے صرف نظر نہیں کرنا چاہیے۔ پاکستان میں کئی ادوارِ حکومت نے اقوامِ متحدہ کے اداروں کی سفارشات کو نظر انداز کیے رکھا۔ اس لیے پارلیمانی کمیٹی، انتظامیہ اور فیصلہ سازوں کو چاہیے کہ وہ اقلیتی خواتین اور بچیوں کی اس صورتِ حال پر ہمدردانہ غور کریں۔

اس مقصد کے لیے معاشرے کے اندر مذہبی تنوع، قانون کی حکمرانی، انسانی وقار اور بنیادی انسانی حقوق کے احترام کے لیے ضروری ہے کہ وفاقی اور صوبائی حکومتیں جبری تبدیلی مذہب کی لعنت سے چھٹکارا پانے کے لیے مندرجہ ذیل اقدامات کریں۔

1- پارلیمانی کمیٹی برائے تحفظ اقلیت اپنے اصول وضوابط اور دائرہ کار کا تعین کرتے ہوئے آئینِ پاکستان میں دی گئی مذہبی آزادی کی ضمانتوں اور سپریم کورٹ آف پاکستان کے احکامات مجریہ 19 جون 2014 مذہبی آزادی کی تشریح کو پیشِ نظر رکھیں۔

2- پارلیمانی کمیٹی نجی اور کھلے عام انکوائری کے ذریعے متاثرین، اہلِ خانہ، سول سوسائٹی کی تنظیموں، اِن معلومات سے باخبر صحافیوں اور سماجی کارکنوں کو اپنے مشاورتی عمل کا حصہ بنائیں تا کہ جلد از جلد جبری تبدیلی مذہب کی روک تھام کے لیے قانونی تحفظ کا بندوبست کیا جا سکے۔ توقع کی جاتی ہے کہ پارلیمانی کمیٹی یہ سفارشات جلد از جلد پارلیمنٹ کے سامنے رکھے گی۔

3- وفاقی اور صوبائی وزارت ہائے انسانی حقوق، قانون اور مذہبی اقلیتی امور ایک جیسی قانون سازی کی تیاری کریں جس میں تعزیراتِ پاکستان کی دفعہ B-298 کی ترمیم پر دوبارہ غور کیا جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ، جب تک یہ قانون سازی مکمل نہ ہو جائے ایسے ضابطے کا اجرا بھی ضروری ہے جس کے تحت تبدیلی مذہب کے دعویٰ کو پرکھا جا سکے کہ کہیں اس میں جبر یا کسی اور قانون شکنی کا پہلو تو نہیں پایا جاتا۔ جب تک یہ قانون سازی مکمل نہ ہو جائے۔

4- سپریم کورٹ آف پاکستان ایسے تمام نکاحوں کی توسیع پر پابندی عائد کر دے جس میں تبدیلی مذہب واقع ہوا ہو۔

5- اقلیتوں کے تحفظ سے متعلق ایک جامع قانون سازی کی ضرورت ہے جو مذہبی امتیاز کے خاتمے سے متعلق آئینی ضمانت پر عمل درآمد کو ممکن بنا سکے۔ نیز اقلیتوں کے معاشی اور سماجی حقوق کا تحفظ بشمول سرکاری ملازمتوں اور تعلیمی مواقع کے لیے کوٹہ پر عمل درآمد کیا جائے۔

6- صوبائی اور وفاقی کابینہ کے خصوصی اجلاسوں کے ذریعے 19 جون 2014 کو منظور کیے گئے سپریم کورٹ کے احکامات پر جلد از جلد عمل درآمد کیا جائے اور ایک بااختیار کمیشن برائے حقوقِ اقلیت کا قیام عمل میں لایا جائے۔

7- ججز، انتظامیہ اور پولیس کی تربیت میں اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ سے متعلق اسباق کو نصاب کا حصہ بنایا جائے۔

8- میاں مٹھو اور ایوب جان سرحدی جیسے مجرم جو جبری تبدیلی مذہب کی اعانت کرتے ہیں اُن کو بااختیار اور شفاف تحقیقات کے ذریعے قانون کے کٹہرے میں لایا جائے۔

(پیٹر جیکب
ایگزیکٹو ڈائریکٹر ادارہ برائے سماجی انصاف)

عورت سوال اٹھاتی ہے

زاہدہ حنا

1857 میں مُغل سلطنت کا خاتمہ ہوا تو اُس کے ساتھ ہی اردو ادب کے زمین و آسمان بھی بدلے گئے۔ کہاں داستانوں کی شہزادیاں اور پرستان کی پریاں تھیں اور کہاں ڈپٹی نذیر احمد نے 'مراۃ العروس' میں ایک نئی عورت کی چھب دکھائی۔ اصغری نام کی ایک کم سن لڑکی ہے جو بیاہ کر آتی ہے اور ایک بے ڈھب، بے ڈھنگے اور بے شعور خاندان کو ایک شائستہ اور خوشحال گھرانے میں بدل دیتی ہے۔ آس پاس کی عورتیں تو ایک طرف رہیں مرد بھی اُس کی عقل کو سلام کرتے ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب گھر کا تمام انتظام و انصرام مردوں کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ غلّہ اور دوسری ضرورت کی چیزیں، حدتو یہ ہے کہ عورتوں کے لیے کپڑے اور جوتیوں کا انتخاب اور دام کی ادائیگی بھی گھر کے مرد براہ راست کرتے تھے۔

بازار سے لے کر پنساری، قصائی، حلوائی اور غلّہ فروش کے یہاں اُدھار چلتا تھا جسے مرد ادا کرتے تھے اور گھر میں بیٹھی ہوئی متوسط طبقے کی شریف عورت کلدار روپے یا نوٹ کو اپنے ہاتھوں سے چھونے کی حسرت ہی رکھتی تھی۔ ایسے میں 1869 میں چھپنے والے قصے ''مراۃ العروس'' کی ہیروئن اردو ادب کے منظر نامے پر ایک معجزے کی صورت طلوع ہوئی۔ اُس نے گھر میں مکتب کھول کر محلے کی بچیوں کو تعلیم دینے کے ساتھ ہی اپنے لیے روزگار کی صورت نکالی اور گھر بھر کا نقشہ بدل دیا۔ شوہر نے سیالکوٹ میں سرکاری نوکری پر رہتے ہوئے پر پرزے نکالے تو دلی سے سیالکوٹ روانہ ہوگئی۔ جہاں اُس نے اپنے شوہر کو راہ راست پر لا کر چھوڑا۔ حدتو یہ ہے کے بیروزگار سُسر کی ملازمت کا انتظام بھی کر ڈالا۔

''مراۃ العروس'' کے فوراً بعد کئی قصے شایع ہوئے جن میں ایسی ہیروئینیں نظر آتی ہیں لیکن رشیدۃ النساء 1894 میں ہمیں مرد اور عورت کے درمیان مساوی مواقع کی بات کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ اس بات کا رشتہ عورت کی تعلیم سے جوڑتی ہیں اور عورت کو برسرِ روزگار ہونے کی ترغیب دیتی ہیں۔

ترقی پسند تحریک کی بنیاد گزاروں میں رشید جہاں تھیں جنھوں نے عورت کے جنسی اور ازدواجی استحصال پر قلم اُٹھایا اور عورتوں کے لیے آزادی کی راہ نکالی۔ اُن ہی کے نقش قدم پر عصمت چغتائی چلیں۔ متوسط اور نچلے متوسط طبقے سے انھوں نے بے دھڑک عورتوں کے کردار تراشے۔ یہ وہ بات تھی جس نے قدامت پسندوں کو اِس حد تک مشتعل کیا کہ اُن پر فحاشی کا مقدمہ چلا۔ فحاشی کا مقدمہ منٹو پر بھی چلا کیونکہ اُنھوں نے طوائف کو اگر مظلوم اور بے اختیار دکھایا تو اِس کے ساتھ ہی بااختیار طوائفیں بھی ہمارے سامنے لا کھڑی کیں۔ اُس زمانے میں تحریک آزادی کے ساتھ ساتھ تقسیمِ ہند کا معاملہ بھی زور و شور سے چل رہا تھا۔ یہی وہ دور ہے جب ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، ممتاز شیریں اور دوسرے افسانہ نگار مرد اور عورتیں سامنے آئیں جن کی تحریروں میں غُربت سے جھنجھلائی ہوئی، جنسی محرومیوں کی مار کھاتی ہوئی اور تقسیم کے خنجر سے ذبح ہونے والی عورت ملتی ہے۔

پاکستان بننے کے فوراً بعد 50 کی دہائی سے ہمارے ادب میں سماجی اور سیاسی بغاوت کی چنگاریاں اُڑتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ فرخندہ لودھی اپنے اردگرد بے بس، مجبورِ محض اور اِنصاف کو ترستی ہوئی عورتیں دیکھتی ہیں اور اُن کے دکھ، اُن کی بربادیاں، تباہیاں کاغذ پر اتار دیتی ہیں۔ اُنھیں اپنے اس اختصاص کا احساس شِدّت سے تھا۔ تب ہی اُنھوں نے اپنی لِکھت کے بارے میں کہا تھا کہ ''میں نے ہمیشہ عورتوں کے پُر اثر کردار تخلیق کرنے کی کوشش کی ہے۔''

''مُنی کیسے مرے'' فرخندہ بخاری کا ایک ایسا افسانہ ہے جس میں نچلے متوسط طبقے کی ایک نہایت ذہین لڑکی ہمیں اپنی چھب دکھاتی ہے۔ سخت گیر مذہبی باپ اور دل کی گہرائیوں سے شوہر پرست ماں کی بیٹی۔ قل اعوذی اُستانیوں اور جھوٹ بولنے والی ہم جماعتوں میں گھِری ہوئی۔ مُنی سوال اٹھاتی ہے اور جواب میں جھڑکیاں اور جھانپڑ کھاتی ہے۔ اُسے اپنے ہونے پر اصرار ہے۔ ہماری لڑکیوں کی اکثریت جیسی زندگی گزارتی ہے اِس کی عکاسی فرخندہ بخاری کے اس افسانے میں بے مثال ہے۔

شمیم اِکرام الحق کا افسانہ ''اندھا قانون'' پڑھتے ہوئے جنرل ضیاءالحق کے لائے ہوئے نئے اِسلام کی اور اُس نابینا صفیہ بی بی کی یاد آتی ہے جس کے ساتھ زنا بالجبر ہوا اور جب وہ حاملہ ہوئی تو اُسے ''زانیہ'' قرار دے کر سنگسار کرنے کا حکم دیا گیا۔ اِس افسانے میں شمیم نے 15 کوڑوں اور 5 سال قید بامشقت کی سزا سن کر باشو کی زبان سے یہ سوال اُٹھایا ہے کہ ''ظالمو اِس جرم میں شریک شخص کو بھی تو تلاش کرو'' شمیم کا یہ جملہ ہمارے افسانے اور سماج میں تادیر گونجتا رہے گا کہ ''میں نعوذ باللہ مریم تو نہیں کہ اللہ کے حکم سے بغیر مرد کے ماں بن گئی۔''

فرخندہ لودھی اپنی کہانی ''دوسرا خدا'' میں ہمیں یہ کہتی نظر آتی ہیں کہ ''ہوش سنبھالتے ہی اُسے معلوم ہوگیا تھا کہ معاشرے میں عورت کا کوئی دوسرا کام نہیں سوائے اس کے کہ وہ شادی کرے اور ہر حال میں شوہر کی خوشنودی حاصل کرے۔''

قرۃ العین حیدر کے ناول گردش رنگ چمن، چاندنی بیگم، سیتا ہرن اور 'پت جھڑ کی آواز' اور ان کی دوسری کہانیوں میں تقدیر کی کروٹ سے طوائف بن جانے والی شریف زادیاں' کنبے کی اور اپنی بھوک کی مار سہتی ہوئی عزت سے چار پیسے کمانے کیلیے اپنا تارِ نظر کڑھت کے ٹانکوں میں اتار دینے والیاں' تار پر چلنے اور میم صاحباؤں کے گھروں میں برتن دھوتی اور فرش چمکانے والی بہادر عورتیں ہیں' حالات کی لہروں پر تنکوں کی طرح ڈولتی ہوئی' یہ فریاد کرتی ہوئی سنائی دیتی ہیں کہ' اب جو کیے ہو داتا' ایسا نہ کیجو' اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجو۔''

آمریت کی سرپرستی میں ہمارے یہاں انتہا پسند عقیدہ پرستی کا سیلاب جس طرح اُمڈا اس نے روشن خیال لکھنے والیوں اور لکھنے والوں کیلیے سنگین مسائل پیدا کیے۔ اب سالہا سال سے ہم ایک ایسے عقیدہ پرست سماج میں رہتے ہیں جہاں وہ آزادیاں اور گنجائشیں ختم ہوگئی ہیں جو برطانوی سامراج کے سائے میں رہتے ہوئے ہمیں حاصل تھیں۔

پاکستانی سماج میں عورت کی پسپائی کی نہایت دل دوز اور سچی تصویر خالدہ حسین نے اپنے افسانے ''دادی آج چھٹی پر ہیں'' میں بیان کی ہے۔ دادی سے پوتی تک زمانہ پاکستانی عورت کیلیے جس طرح الٹے قدموں چلا ہے، اس کی عکاسی بے مثال ہے۔ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ دادی جو کالج میں پروفیسر ہے۔ وہ اپنے بد باطن شوہر اور عقیدہ پرست بیٹے کے ہاتھوں جو صدمے اٹھاتی ہے، پوتی سے جس کا تعلق اور محبت کا رشتہ ممنوع ٹھہرتا ہے، وہ آج کے اِن بے شمار گھروں کی کہانی ہے جہاں مذہب کے نام پر بیٹوں نے ماں سے اُس کا اختیار چھین لیا۔ جنھیں اُن کے بیٹے کافر کہتے ہیں اور دوزخ میں جانے کا مژدہ سناتے ہیں اور اعلان کرتے ہیں کہ وہ اپنی ماں کے وَلی ہیں۔

مراۃ العروس کی ہیروئن ''اَصغری'' جس کی پیدائش 1869 میں ڈپٹی نذیر احمد کے قلم سے ہوئی اور 1881 میں رشیدۃ النسا نے جس اَشرف النسا کو تخلیق کیا وہ اگر آج زندہ ہوکر ہمارے درمیان آجائیں تو جیلانی بانو، واجدہ تبسم، پروین عاطف، خالدہ حسین، فرخندہ بخاری، اُمِ عمارہ اور دوسری لکھنے والیوں اور لکھنے والوں کے بے اختیار اور بے بس نسائی کرداروں کو دیکھ کر شاید غش کھا جائیں۔

سوچنے کی بات ہے کہ کیا یہ برطانوی راج کی عطا تھی جس نے ہمارے لکھنے والوں اور لکھنے والیوں سے بااختیار عورتوں کے کردار تراشوائے؟ **فرقہ وارانہ بنیادوں پر ملک کی تقسیم نے اردو ادب اور عورتوں کی کردار نگاری پر کیا اثرات مرتب کیے اس کا جائزہ آج شاید بہت ضروری ہوگیا ہے۔**

ہمارے یہاں کئی دہائیوں سے عورت کے بااختیار ہونے کی لڑائی سیاست، سماج اور ادب کے صفحوں پر شدت سے لڑی جارہی ہے۔ ادب زندگی کا آئینہ دار ہے، اِس میں جھوٹے کردار نہیں تراشے جاتے۔ آج کے اردو افسانے اور ناول میں باغی عورتوں کی آبادی بڑھتی جارہی ہے۔ وہ اِزدواجی زندگی میں جبری جنسی تعلق پر برافروختہ ہے، اپنی کوکھ پر اپنے اختیار کا سوال اٹھاتی ہے، اِس کا بااختیار شوہر گھر میں بیٹیوں کی طرح رہنے والی کم عمر لڑکی کے ساتھ زنا بالجبر کرے تو وہ گٹر کھولنے کے لیے رکھا ہوا تیزاب اس کے نچلے دھڑ پر لوٹ دیتی ہے۔

ایسی عورتیں ہیں جو نامرد بیٹوں کی ماؤں سے اپنی محرومیوں پر سوال اٹھاتی ہیں، ایسی عورتیں ہیں جو اپنی نسل چلانے کیلیے اپنی بہوؤں کو اُن کے تصرف میں دے دیتی ہیں۔ ہمارے ادب کے صفحوں پر سانس لیتے ہوئے یہ نسائی کردار عقیدے، قانون اور رسم و رواج کے بارے میں ایسے تیکھے اور کڑوے سوال اٹھاتے ہیں کہ جبہ و دستار اور میزانِ عدل کے سائے میں بیٹھے ہوئے صاحبانِ عدل کی پیشانیوں پر پسینہ آجاتا ہے۔ سماج، رواج، سیاست، نظامِ عدل اور ادب میں عورت کے سوال اٹھانے کا سفر جاری ہے۔

(بشکریہ ایکسپریس نیوز)

جنسی تشدد سہنے والی خواتین کو سمجھنے کے لیے ہم کچھ نہیں کر رہے

لزی ڈیننگ

گھریلو تشدد کے کیسز میں سزا سنائے جانے کی شرح میں تو اضافہ ہو رہا ہے لیکن جنسی تشدد کے کیسز میں سزا سنانے میں کمی ہو رہی ہے، ہم متاثرہ افراد کے ساتھ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟

لوگوں سے جب آپ پوچھیں گے کہ وہ 'گھریلو تشدد' یا ڈومیسٹک وائلینس کے بارے میں کیا سوچتے ہیں تو زیادہ تر شاید جواب دیں کہ اِس میں لاتیں اور مکے مارنا اور چیخنا چلانا شامل ہے۔ لیکن وہ لوگ جو مُسلط کردہ رشتوں میں رہ رہے ہوتے ہیں وہ بھی جنسی تشدد کے متاثرین میں شمار ہوتے ہیں۔

حکومت نے جنسی تشدد اور گھریلو تشدد کے لیے الگ الگ فنڈنگ قائم کر رکھی ہیں لیکن ان دونوں میں فرق کرتی لکیر بہت دھندلی ہے۔ اس حوالے سے اعداد و شمار بھی ملتے جلتے ہیں۔ دنیا میں تقریباً چار میں سے ایک خاتون گھریلو تشدد کا شکار ہوتی ہے جبکہ تقریباً پانچ خواتین میں سے ایک اپنی بلوغت میں جنسی تشدد کا سامنا کرتی ہے۔ ایسا سوچنا بہت سادگی کی بات ہوگی کہ ایسا ایک ہی خاتون کے ساتھ نہ ہوا ہو۔

صرف ایسا نہیں ہے کہ لوگ غیر جنسی تشدد کو آسانی سے سمجھ سکتے ہوں بلکہ عدالتوں میں بھی اس حوالے سے کھلا تعصب پایا جاتا ہے۔ اس ہفتے ہی رپورٹ کی گئی تفصیلات کے مطابق ویلز میں گھریلو تشدد میں سزا سنائی جانے کے واقعات کی شرح میں اضافہ ہو رہا ہے (18-2017 میں یہ شرح 78 فیصد تھی)۔ جبکہ انگلینڈ اور ویلز میں جنسی تشدد میں سزا سنائی جانے کی شرح پانچ سال کی پست ترین سطح پر آ چکی ہے۔ گذشتہ سال اپریل اور ستمبر کے دوران صرف 37 فیصد مقدمات کروان پراسیکیوشن سروس کو بھیجے گئے۔

ایک پُرتشدد رشتے میں تشدد کرنے والا شخص جسمانی حملے کے بعد اپنے متاثرہ پارٹنر کو جنسی تعلق قائم کرنے پر بھی مجبور کر سکتا ہے۔ اکثر 'معافی' کے پردے میں اپنی مرضی کے نتائج حاصل کرنے کی کوشش چھپی ہوتی ہے۔ یہ دونوں عوامل ہی طاقت، تذلیل اور اپنا زور دکھانے پر مبنی ہوتے ہیں۔

پیٹربورو ریپ کرائسز سینٹر میں رضاکارانہ خدمات کے دوران میں یہ جان کر صدمے میں آ گئی تھی کہ جنسی تشدد کے حوالے سے فنڈز جمع کرنا کتنا مشکل کام ہے۔ ہمیں مقامی سپر منڈی میں بطورِ ٹوکن بھی جگہ دستیاب نہیں تھی کیونکہ لوگوں کے لیے 'ریپ' کا لفظ برداشت کرنا مشکل تھا جبکہ میں کئی مقامات پر لوگوں کو گھریلو تشدد کے متاثرین کے لیے فنڈز اکٹھا کرتا دیکھ چکی ہوں۔ ایک متاثرہ شخص کے لیے یہ تفریق بہت نقصان دہ ہو سکتی ہے۔ اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ تشدد کی دوسری اقسام کے برخلاف جنسی تشدد کے متاثرین کسی طرح سے اپنی حالت کے خود ہی ذمہ دار ہیں۔

صرف ایسا نہیں ہے کہ لوگ غیر جنسی تشدد کو آسانی سے سمجھ سکتے ہوں بلکہ عدالتوں میں بھی اِس حوالے سے کھُلا تعصب پایا جاتا ہے۔ اس ہفتے ہی رپورٹ کی گئی تفصیلات کے مطابق ویلز میں گھریلو تشدد میں سزا سنائی جانے کے واقعات کی شرح میں اضافہ ہو رہا ہے (18-2017 میں یہ شرح 78 فیصد تھی)۔ جبکہ انگلینڈ اور ویلز میں جنسی تشدد میں سزا سنائی جانے کی شرح پانچ سال کی پست ترین سطح پر آ چکی ہے۔ گذشتہ سال اپریل اور ستمبر کے دوران صرف 37 فیصد مقدمات کروان پراسیکیوشن سروس کو بھیجے گئے۔

یہ جنسی تشدد کے متاثرین کے لیے ایک پریشان کُن پیغام ہے۔ میں بہت سے ایسے لوگوں کو جانتی ہوں جو پولیس کے پاس نہیں جائیں گے کیونکہ وہ خوفزدہ ہیں کہ اُن پر یقین نہیں کیا جائے گا یا اُن سے اُن کے فون ریکارڈز اور سابقہ تعلقات کے بارے میں سوالات کیے جائیں جس سے متاثرین پر ہی الزام دھرنے کا تاثر ملتا ہے۔ یہاں میں اُن لوگوں کا ذکر نہیں کر رہی جو پولیس تک جانے کی ہمت کر چکے ہیں اور دردناک بیان دے کر بھی ملزم کے خلاف اُن کا کیس خارج ہو گیا ہو۔ جب جنسی تشدد کے متاثرین کو دیکھائی دیتا ہے کہ ملزم کو سزا ملنے کے امکانات بہت کم ہیں تو اُن کے اِس قانونی عمل کا حصہ نہ بننے کے فیصلے کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔

سروائیورز سٹوری نامی اپنی ویب سائٹ شروع کرتے ہوئے میں نے بہت سے ایسی خواتین سے بات کی جنہوں نے جذباتی اور جسمانی استحصال کے حوالے سے مدد طلب کی۔ ایسا اُن کی جانب سے جنسی تشدد کے زخموں کو بھرنے کا فیصلہ لینے سے بھی سالوں پہلے کیا گیا۔ ایک خاتون نے مجھے بتایا کہ وہ اپنے تشدد پسند ساتھی سے

علیحدگی کے بعد ویمن ایڈ کے پاس گئی لیکن ایک ریپ کرائسز سینٹر جانے کے بارے میں فیصلہ نہیں لے پائیں۔ اُنہوں نے مجھے بتایا کہ اُنہیں لگا وہ 'کسی اجنبی کے ہاتھوں ریپ کا شکار ہونے والی کسی خاتون کا حق غصب کرنے کے بارے میں پریشان تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی بہت اہمیت ہے کہ ہم کسی بھی قسم کے تشدد کے متاثرین سے کیسے بات کرتے ہیں۔

جب تک معاشرہ اور میڈیا یہی سوچتا رہے گا کہ ریپ کسی اجنبی کے ہاتھوں گلی میں ہونے والا تشدد کا صرف ایک واقعہ ہے اور ایسی زبان کا استعمال جاری رکھے گا جس میں الزام متاثرین پر ہی دھرا جائے گا تو وہ خواتین جو منظّم انداز میں یا اپنے کسی ساتھی کے ریپ کا مسلسل نشانہ بنی ہیں وہ خود کو مدد حاصل کرنے کے قابل نہیں سمجھیں گی۔

اس رسوائی کے احساس کو یہ ملزمان بہت بہتر انداز میں سمجھتے ہیں۔ یہ اُن کی جانب سے ایسی خواتین کو اپنے ساتھ رکھنے کے لیے اپنائے جانے والے ہتھکنڈوں پر مبنی ترکش کا ایک تیر ہے کیونکہ۔ وہ جس پر تشدد کر رہے ہوتے ہیں اسے یہ کہہ کر چپ کرواتے ہیں کہ 'کوئی تم پر یقین نہیں کرے گا' یا 'تم یہی چاہتی تھی'۔

لوگ صرف مخصوص قسم کے تشدد کے متاثرین کی مدد کر کے اچھا محسوس کیوں کرتے ہیں جبکہ یہ تشدد ایک جیسے رویے سے ہی جنم لیتا ہے۔ ہمیں مختلف تجربات سے گزرنے والے متاثرین کو اچھے طریقے سے سننا چاہیے اور ریپ کے بارے میں بات کرنی چاہیے۔ صرف اسی صورت میں ہی ہم مدد حاصل کرنے کی اُن کی کوششوں کی مدد کر سکتے ہیں۔ اس بات سے فرق نہیں پڑنا چاہیے کہ اُن پر ہونے والا تشدد کس قسم کا تھا۔

(بشکریہ انڈیپنڈنٹ اردو)

سماجی حقوق سے متعلق بنیادی معلومات

ظفراللہ خان

انسانی حقوق کا عالمی منشور 1948ء

آرٹیکل 15

(1)۔ ہر شخص کو قومیت (Nationality) کا حق ہے۔

(2)۔ کوئی شخص محض حاکم کی مرضی پر اپنی قومیت سے محروم نہیں کیا جائے گا اور اس کو قومیت تبدیل کرنے کا حق دینے سے انکار نہیں کیا جائے گا۔

شہریت کیا ہے؟

قانونی اعتبار سے شہریت سے مراد کسی ریاست میں فرد کی قانونی حیثیت ہے۔ فرد اور ریاست کے درمیان یہی رشتہ اس کے عمرانی معاہدہ، اور سیاسی اور معاشی حقوق کا تعین کرتا ہے۔

شہریت پر تحقیق کرنے والے محقق اِس کی مختصر اور جامع تعریف یوں کرتے ہیں۔ "شہریت سے مراد کسی معاشرے کی رکنیت"۔ اس تعریف سے ہمیں رکنیت کی شرائط اور ذمہ داریوں کی بابت بھی علم ہوتا ہے۔ یہ رکنیت پیدائشی استحقاق، ہجرت، سرمایہ کاری وغیرہ کے ذریعہ ملتی ہے۔ بعض ممالک کے آئین اور قوانین "دوہری شہریت" کی بھی اجازت دیتے ہیں۔

اکثر اوقات "شہریت" اور "قومیت" کی اصطلاحات کو آپس میں گڈمڈ بھی کیا جاتا ہے۔ گلوبلائزیشن کے دور میں کم از کم فکری سطح پر "عالمی شہری" کی اصطلاح بھی سامنے آئی ہے۔ شہریت ایک قانونی تصور ہے اور اس کے ساتھ ہر ملک اپنی اپنی شرائط اور فرائض منسلک کرتا ہے۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ کسی ملک میں رہنے کا لازمی مطلب یہ نہیں کہ ہم اس کے شہری ہیں۔

ہم اکثر ایک اصطلاح "متحرک شہریت" بھی سنتے ہیں۔ جس سے مراد معاشرے میں فعال کردار ادا کرنا ہے۔

پاکستانی شہریت

1947ء میں قیامِ پاکستان کے بعد سے یہاں شہریت کے حوالے سے دلچسپ مباحثے ہوئے۔ بانیِ پاکستان قائدِاعظم محمد علی جناح نے 11 اگست 1947ء کو اپنے تاریخی خطاب میں پاکستانی شہریت کے خدوخال کچھ یوں واضح کیے۔

"آپ سب آزاد ہیں، آپ اپنے مندروں میں جانے کے لیے آزاد ہیں، آپ اپنی مسجدوں میں جانے کے لیے آزاد ہیں یا آزادِ ریاستِ پاکستان کی کسی عبادت گاہ میں جانے کے لیے۔ آپ کا تعلق کسی بھی مذہب، عقیدے، قوم یا فرقے سے ہوسکتا ہے ریاست کو اس سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے"۔ آگے چل کر انہوں نے کہا، "ہم ایسے دنوں میں آغاز کر رہے ہیں جب ہمارے درمیان کسی قسم کے نسلی یا فرقہ وارانہ تعصب کا وجود نہیں ہے۔ ہم اِس بنیادی اصول کے ساتھ ایک نئے دور کا آغاز کرنے جا رہے ہیں جس کے مطابق ہم سب شہری ہیں، ایک ریاست کے برابر حقوق کے مالک شہری"۔ بانیِ پاکستان نے یہ بھی کہا کہ " آپ دیکھیں گے کہ وقت کے ساتھ ساتھ، مسلمان-مسلمان نہیں رہے گا اور ہندو-ہندو نہیں رہے گا، میں مذہبی معنوں میں ایسا نہیں کہہ رہا کیونکہ یہ تو ہر فرد کے مذہبی حوالے سے عقیدے کا سوال ہے، میں تو ریاست

شہریت پر تحقیق کرنے والے محقق اس کی مختصر اور جامع تعریف یوں کرتے ہیں۔ "شہریت سے مراد کسی معاشرے کی رکنیت"۔ اس تعریف سے ہمیں رکنیت کی شرائط اور ذمہ داریوں کی بابت بھی علم ہوتا ہے۔ یہ رکنیت پیدائشی استحقاق، ہجرت، سرمایہ کاری وغیرہ کے ذریعہ ملتی ہے۔ بعض ممالک کے آئین اور قوانین "دوہری شہریت" کی بھی اجازت دیتے ہیں۔

کے شہری کی حیثیت سے سیاسی حوالے سے بات کر رہا ہوں۔"

بانیِ پاکستان کا یہ خطاب ایسی قوم اور شہریت کا تصور اجاگر کرتا ہے جسمیں شہریوں کے درمیان مساوات کا تصور غالب ہو اور مذہب یا عقیدے کی بنیاد پر تفریق نہ ہو۔ پاکستان کی سول سوسائٹی قائداعظم کی اس ایک ہزار چھ سو اٹھارہ الفاظ پر مشتمل تقریر کو ملک کا "میگنا کارٹا" قرار دیتی ہے کیونکہ اِس میں کھلے انداز میں ریاست کے مزاج اور مستقبل کے امورِ ریاست کی تشریح کی گئی۔ تاہم ضمیر نیازی اپنی کتاب 'صحافت پابندِ سلاسل' میں بیان کرتے ہیں کہ انتظامیہ نے اِس تقریر کو پریس میں چھپنے سے روکنے اور سینسر لگانے کی بہت کوشش کی۔ اچھی بات یہ ہے کہ پاکستان کی پارلیمان نے آنے والی نسلوں کی خاطر اِس تقریر کو محفوظ کرلیا۔ اِس روز کی لفظ بہ لفظ کارروائی پاکستان کی نیشنل لائبریری اور قومی اسمبلی کی لائبریری میں محفوظ ہے بلکہ قومی اسمبلی آف پاکستان کی ویب سائٹ پر بھی دستیاب ہے۔ اس تقریر کی مکمل عبارت اسمبلی کے احاطہ میں بھی آویزاں ہے۔

12 اگست 1947 کو پاکستان کی مجلسِ دستور ساز نے 16 اراکین پر مشتمل ایک کمیٹی کے قیام کی منظوری دی جو کہ شہریوں اور اقلیتوں کے بنیادی حقوق کے لیے پارلیمانی کمیٹی تھی اور اِس کے کام کی بنیاد پر ریاست کا دستوری ڈھانچہ تعمیر ہونا تھا۔ اِس کمیٹی کی رپورٹوں میں پاکستانی شہریت کی تشریح کے حوالے سے اچھا خاصا کام ہوا۔

تاہم پاکستانی شہریت کے حوالے سے پہلا سوال 18 مئی 1948 کو مجلسِ دستور ساز میں اُٹھا جب اسمبلی کے اراکین کی "پاکستانی شہریت" پر بات ہوئی۔ اسمبلی کے قواعد میں ترمیم کی گئی کہ وضاحت ہو سکے کہ کون پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کا رکن ہوسکتا ہے۔ اِس ترمیم کے ذریعے شہریت کے دو اصول سامنے آئے۔ اوّل، پاکستان سے وفاداری اور دوئم، 14 اگست 1947ء کے بعد کم از کم چھ ماہ کی سکونت۔ قیامِ پاکستان کے بعد ہجرت اور فسادات میں ہونے والی قتل و غارت نے اِس سوال کو اہم بنا دیا کہ بیک وقت دونوں ریاستوں یعنی انڈیا اور پاکستان میں "سیاسی مستقبل" تلاش نہیں کیا جاسکتا۔

چونکہ دستور بنانے کا عمل سست روی کا شکار تھا اس لیے شہریوں اور اقلیتوں کے حقوق کی پارلیمانی کمیٹی نے پاکستانی شہریت کے سوال کو اسمبلی میں طے کرنے کی بات کی اور 1951ء میں "پاکستان شہریت ایکٹ" منظور ہوا۔ یہ بل پہلے دستور ساز اسمبلی میں آیا بعدازاں تجویز دی گئی کہ اسے قانون ساز اسمبلی کے طور پر اجلاس میں منظور کیا جائے۔ اس اثناء میں لیاقت-نہرو معاہدہ کے تحت 8 اپریل 1950 میں طے ہوا کہ دونوں ممالک اپنی اپنی اقلیتوں کے لیے مساویانہ شہریت کے لیے کام کریں گے اور عملی اقدامات اٹھائیں گے۔

پاکستان شہریت ایکٹ 1951ء

پاکستان شہریت بل 9 اپریل 1951 کو اِس وقت کے وزیر داخلہ خواجہ شہاب الدین نے مجلس قانون ساز میں متعارف کرایا جسے 10 اپریل 1951 کو منظور کرلیا گیا اور اِس کا اطلاق 13 اپریل 1951 سے گزٹ نوٹیفکیشن کے بعد سے ہوتا ہے۔

پاکستان شہریت ایکٹ 1951ء میں شہریوں کی تعریف کچھ یوں کی گئی۔

پاکستانی شہریت کا حلف نامہ

میں.....

رہائشی.....

قسم کھاتا/کھاتی ہوں کہ میں دستورِ پاکستان کا حامی اور سچا وفادار رہوں گا/گی۔

بحوالہ سیکشن 10، پاکستان شہریت ایکٹ 1951۔

اوّل:۔ جس کے والدین یا آباء اُن علاقوں میں پیدا ہوئے جو 14 اگست 1947ء کے بعد پاکستان میں شامل ہیں اور جو پاکستان کے علاوہ کسی دوسرے ملک کا مستقل رہائشی نہ ہو۔

دوئم:۔ جس کے والدین یا آباء اُن علاقوں میں پیدا ہوئے جو 31 مارچ 1937ء کو انڈیا میں شامل تھے اور اُس کے پاس جانشینی ایکٹ 1925 کے تابع ڈومی سائل ہو اور وہ اُن علاقوں میں ہو جو پاکستان ہیں۔

سوئم:۔ وہ جو ہر برطانوی رعایا کے طور پر شہری بنے اور اس ایکٹ کے نفاذ سے پہلے کسی دوسری ریاست کے شہری بنے، دوسری شہریت کو ترک کر کے حلف نامہ دے کر پاکستان کے شہری بن سکیں گے۔

چہارم:۔ جنہوں نے اِس ایکٹ کے نفاذ سے پہلے یہاں برصغیر پاک و ہند کے علاقوں سے ہجرت کی اور یہاں مستقلاً رہنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

ایکٹ کے سیکشن 4 کے مطابق پیدائشی شہریوں کی وضاحت کی گئی ہے، سیکشن 5 میں سلسلہ نصب کے اعتبار سے شہریت، سیکشن 6 میں ہجرت کے ساتھ شہریت یکم جنوری 1952 کی کٹ آف تاریخ کے ساتھ اور سیکشن 9 میں غیر ملکی کو شہریت دینے (Naturlization) کے حوالے سے وضاحت کی گئی ہے۔ اِس ایکٹ کے کل 23 سیکشنز ہیں اور اِس پر عملدرآمد کے لیے رولز 152 میں بنائے گئے۔ ابتک اس قانون میں متعدد بار ترامیم ہو چکی ہیں اور اسکی بعض شقوں کے حوالے سے عدالتی فیصلے بھی آئے۔ ایکٹ میں دوہری شہریت کے حوالے سے بھی سیکشن موجود ہے۔

تنقیدی جائزہ

- پاکستان شہریت ایکٹ 1951 یہاں پیدا ہونے والے اُن بچوں کو شہریت نہیں دیتا جن کے والد کے پاس ڈپلومیٹک ڈھال ہو یا پھر وہ اجنبی دشمن (alien enemy) ہو۔
- ایکٹ پناہ گزینوں کے حوالے سے خاموش ہے حالانکہ پاکستان میں افغان اور بنگلہ دیشی پناہ گزینوں کی اچھی خاصی تعداد موجود ہے۔
- ایکٹ پاکستانی نژاد بچوں کو بیرون ملک پیدا ہونے پر خودبخود شہریت نہیں دیتا بلکہ اُن کی پاکستانی سفارت خانوں میں رجسٹریشن لازمی ہے۔
- ہجرت کے ذریعہ آنے والوں کے لیے ایکٹ آخری تاریخ کا تعین یکم جنوری 1952 کے طور پر کرتا ہے۔
- جبکہ تقسیم کے بعد منقسم خاندانوں میں میل جول اور شادی کا کلچر اور روایت موجود ہے۔
- قانون مطابق شہریت اختیار کرنے کو Naturalization Act 1926 سے مشروط کیا گیا ہے اور اس کو منظور یا مسترد کرنے کا اختیار وفاقی حکومت کے پاس ہے۔ تاہم جموں و کشمیر کے شہریوں کو پاکستانی شہری کا درجہ دیا گیا ہے۔

پاکستانی شہریت کی ابتداء بانیانِ پاکستان کی مساویانہ شہریت کی ضمانتوں کے ساتھ ہوئی۔ قانون کی زبان میں آج بھی کاغذوں میں سبھی برابر ہیں مگر عملی صورتحال مذہبی اقلیتوں کے لیے اکثر تلخ ہو جاتی ہے۔ شانتی نگر سے یوحنا آباد تک ہجوم کے ہاتھوں مذہبی اقلیتوں کی آبادی تباہ ہوئی۔ بعض مذہبی اقلیتوں کے قبرستان تک محفوظ نہیں۔

- ایکٹ غیر ملکی خواتین کو پاکستانی مردوں سے شادی پر شہریت عطا کرتا ہے تاہم اگر پاکستانی خواتین کسی غیر ملکی سے شادی کر لیں تو اس حوالے سے قانون کا امتیازی چہرہ سامنے آتا ہے۔ یہ حق ابتداء میں یکم جنوری 1949 سے پہلے برطانوی رعایا سے شادی پر تھا۔
- ابتداء میں ایکٹ میں دوہری شہریت کی گنجائش نہیں تھی۔ تاہم 1972ء میں ایک ترمیم کے ذریعے یہ ممکن بنائی گئی۔

ایکٹ شہریوں کی باقاعدہ رجسٹریشن اور پیدائش کی رجسٹریشن کی بات کرتا ہے۔ تاہم شہریوں کی رجسٹریشن 1973 میں شروع ہوئی اور باقاعدہ شناختی کارڈ جاری ہوئے۔ بچوں کی پیدائش کی رجسٹریشن کا کلچر آج بھی کمزور ہے۔ تاہم شہریوں کا ایک مؤثر ڈیٹا بیس نادرا کے نظام کے تحت بنایا جا چکا ہے۔ خواجہ سراء برادری کو رجسٹریشن اور ووٹ کا حق عدالتی فیصلہ کے بعد ملا۔

پاکستانی شہریت کیسے ختم ہو سکتی ہے؟

- پاکستانی شہری کسی دوسرے ملک کی شہریت حاصل کر لے جس کے ساتھ پاکستان کا دوہری شہریت کا معاہدہ نہ ہو۔
- پاکستانی شہری ازخود اپنی شہریت ترک کرنے کا اعلان مجاز اتھارٹی کے سامنے کرے۔
- اگر اس نے فراڈ یا غلط بیانی سے پاکستانی شہریت حاصل کی ہو۔ یا پھر پاکستان سے عدم وفاداری کرے اور ملک کے دشمنوں سے غیر قانونی تجارت یا کمیونیکیشن کا رابطہ رکھے۔ ملک کا وفادار نہ رہے۔
- حکومت اس شخص کی شہریت ختم کر سکتی ہے جو سات سال سے زائد عرصہ بیرون ملک رہے اور وہ سرکاری ملازم نہ ہو اور یا اس نے خود کو پاکستانی سفارتخانہ کے ساتھ رجسٹرڈ نہ کیا ہو۔
- وہ جو 1971ء کے بعد بنگلہ دیش میں رہنا شروع کر دے یا پھر وہاں ہجرت کر گیا ہو۔ اسی شق میں یکم مارچ 1947 کے بعد بھارت ہجرت کر جانے والوں کے بارے میں بھی ذکر تھا تاہم اس میں واپسی کا محدود راستہ رکھا گیا تھا۔
- اگر کسی کی پاکستانی شہریت ختم ہو تو اس کے کم سن بچوں کی شہریت بھی ختم کر دی جاتی ہے تاوقتیکہ وہ بچہ 21 سال ہونے کے بعد دوبارہ شہری بننے کی درخواست دے۔
- شہریت ختم کرنے کے عمل میں شہری کو شوکاز نوٹس یا تنبیہ کرنا لازمی ہے۔

پاکستانی شہریت کا عملی تجربہ

- پاکستانی شہریت کی ابتداء بانیانِ پاکستان کی مساویانہ شہریت کی ضمانتوں کے ساتھ ہوئی۔ قانون کی زبان میں آج بھی کاغذوں میں سبھی برابر ہیں مگر عملی صورتحال مذہبی اقلیتوں کے لیے اکثر تلخ ہو جاتی ہے۔ شانتی نگر سے یوحنا آباد تک ہجوم کے ہاتھوں مذہبی اقلیتوں کی آبادی تباہ ہوئی۔ بعض مذہبی اقلیتوں کے قبرستان تک محفوظ نہیں۔
- مذہبی اقلیتوں کو جبری تبدیلی مذہب کی بھی شکایات ہیں۔ نیز 1985 سے ان کے لیے سیاسی نمائندگی کے لیے مخصوص نشستیں بھی منجمد ہیں جبکہ دیگر تمام نشستیں بڑھی ہیں۔
- خواتین کے حوالے سے شہریت ایکٹ کی شق (2) 10 میں آئین کے آرٹیکل 25 کے برعکس صنف کی بنیاد پر امتیاز نظر آتا ہے۔ اگرچہ 2000 میں ایک ترمیمی ایکٹ کے ذریعہ غیر ملکی مرد سے شادی کرنے والی عورت کے بچوں کو شہریت دینے کی راہ کھلی لیکن آج بھی اُن کے خاوند کو شہریت دینے کے حوالے سے قانون خاموش ہے اور متعدد بار اس حوالے سے آواز اٹھائی گئی اور کئی پرائیویٹ ممبر بل بھی پیش ہوئے لیکن کوئی عملی پیش رفت نہ ہو سکی۔

- اسی طرح خواجہ سراؤں کی رجسٹریشن کا عمل عدالتی فیصلہ کے بعد ہوا۔ ان کی بہتری کے لیے قانون بھی منظور کیا گیا لیکن ابھی بھی انہیں برابر کا شہری تسلیم کرنے میں بہت جدوجہد درکار ہے۔
- پاکستان تاریخی اعتبار سے لاکھوں افغان پناہ گزینوں کا عرصہ دراز سے گھر ہے۔ تاہم شہریت کا ایکٹ اس حوالے سے خاموش ہے کہ پناہ گزین یا انکے بچے کچھ عرصہ کے بعد شہری بن سکیں گے۔ اس ضمن میں عدالتی فیصلے بھی ہوئے جب یہاں جنم لے کر جوان ہونے والے پناہ گزینوں نے شہریت کا حق مانگا۔ اس حوالے سے وزیراعظم عمران خان کا ایک بیان سامنے آیا جس میں انہوں نے افغان مہاجرین اور بنگلہ دیشی مہاجرین کو شہریت دینے کا وعدہ کیا تاہم اس پر کوئی عملی پیش رفت ابھی تک سامنے نہیں آئی۔ یہاں یہ تذکرہ بے جا نہ ہوگا کہ پاکستان نے پناہ گزینوں کے حوالے سے اقوام متحدہ کے 1951 کے کنونشن پر دستخط نہیں کیے ہیں۔
- اگرچہ پاکستان کے قانون میں دوہری شہریت کی گنجائش موجود ہے اور 9 ملین (90 لاکھ) کے لگ بھگ بیرون ملک مقیم پاکستانی ملکی معاملات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ عرصہ دراز سے بیرونِ ملک پاکستانی ووٹ کے حق کے لیے جدوجہد کرتے رہے۔ جو کہ 2018ء میں ٹیکنالوجی کی مدد سے انہیں عطا بھی کر دیا گیا ہے۔ تاہم آئین پاکستان دوہری شہریت رکھنے والوں پر الیکشن لڑنے کی پابندی عائد کرتا ہے۔ ماضی میں متعدد اراکین پارلیمان اس بنیاد پر نااہل بھی ہوئے۔ اب حکومت آئین میں ترمیم کر کے بیرون ملک مقیم پاکستانیوں کو الیکشن لڑنے کا حق دینا چاہتی ہے۔ پاکستان میں عدلیہ یا انتظامیہ کا حصہ بننے کے لیے دوہری شہریت پر کوئی پابندی نہیں ہے۔

دستورِ پاکستان

بنیادی حقوق اور حکمتِ عملی کے اصول

کسی بھی ملک کے لیے دستور بنیادی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسے ریاست اور شہریوں کے مابین عمرانی معاہدہ کہا جاتا ہے۔ جمہوری ممالک میں عوام کے منتخب نمائندے دستور ساز اسمبلی میں اسے تحریر کرتے ہیں۔ اس اہم ترین قومی دستاویز میں ریاست کے جغرافیے کا تعین، ملک کے نظام کی روح، مزاج اور سمت کا بیان ہوتا ہے۔ دستور ہی قانون کو جواز، حکومت کو اختیار، اکائیوں کے درمیان وسائل کی منصفانہ تقسیم کا فارمولا اور عوام کو بنیادی حقوق دیتا ہے۔

آج دستور ہمورابی کے آئین اور اشوکا کی تختیوں کی طرح پتھر پر کندہ نہیں ہوتا بلکہ اسے زندہ دستاویز کہا جاتا ہے جس میں میں حالات اور ضروریات تبدیل ہو جانے پر ضابطہ کے مطابق ترامیم کا اختیار ہوتا ہے۔ شکاگو یونیورسٹی کی ایک تحقیق جو کہ دستاویز کی اوسطاً عمر کے حوالے سے تھی میں کہا گیا کہ یہ عرصہ 17 سال کے قریب بنتا ہے۔ اگرچہ دنیا میں صدیوں پرانے دستور آج بھی رائج العمل ہیں تاہم یہ اوسطاً عمر ہے، جس کے بعد کئی ممالک اپنے مخصوص حالات یا پھر جمہوری دستوری نظر ثانی کے عمل سے گزرتے ہیں۔

اگرچہ پاکستان کے قانون میں دوہری شہریت کی گنجائش موجود ہے اور 9 ملین (90 لاکھ) کے لگ بھگ بیرون ملک مقیم پاکستانی ملکی معاملات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ عرصہ دراز سے بیرونِ ملک پاکستانی ووٹ کے حق کے لیے جدوجہد کرتے رہے۔ جو کہ 2018ء میں ٹیکنالوجی کی مدد سے انہیں عطا بھی کر دیا گیا ہے۔

پاکستان کی دستوری تاریخ کئی نشیب و فراز کی امین ہے۔ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی نے 10 اگست 1947ء کو اپنے کام کی ابتداء کی لیکن ملک کو پہلا دستور 1956ء کو نصیب ہوا۔ برسوں کی ریاضت 1958ء میں اس وقت رائیگاں ٹھہری جب ملک میں پہلا مارشل لاء لگا۔ 1962ء میں فردِ واحد کی دانش پر مبنی آئین آیا جو 1969ء میں ان کے ساتھ ہی تاریخ کے کوڑے دان میں چلا گیا۔ 1970ء میں بالغ رائے دہی کی بنیاد پر عام انتخابات ہوئے لیکن دستور کی چھتری انتقالِ اقتدار کے لیے دستیاب نہ تھی اور طاقت کے زور پر معاملات سلجھانے کی روش نے ملک دولخت کر دیا۔

1973 میں قومی اسمبلی نے دستور ساز اسمبلی کے طور پر کام کرتے ہوئے آئین منظور کیا جو دوبار معطل ہونے کے باوجود آج بھی رائج ہے اور اس پر وسیع پیمانے پر قومی اتفاقِ رائے ہے۔

آئینِ پاکستان 1973ء کا ڈھانچہ

دیباچہ
ہم جمہورِ پاکستان
قراردادِ مقاصد
(ضمیمہ)

.....

ریاست کی تعریف
نوعیت اور مزاج

آرٹیکل 1 سے 7 تک

.....

بنیادی حقوق
آرٹیکل 8 سے 28 تک
حکمتِ عملی کے اصول
آرٹیکل 29 سے 40 تک

.....

وفاقِ پاکستان
صدرِ مملکت
آرٹیکل 41 سے لے کر 49 تک

.....

مجلسِ شوریٰ
پارلیمان
آرٹیکل 50 سے 89 تک

.....

وفاقی حکومت
آرٹیکل 90 سے 100 تک

.....

صوبے
گورنر، صوبائی اسمبلیاں اور صوبائی حکومتیں
آرٹیکل 101 سے 140 تک

.....

مقامی حکومت
آرٹیکل 140
(الف)

.....

وفاق اور صوبوں کے مابین تعلقات
آرٹیکل 141 سے 159 تک

.....

مالیاتی امور
آرٹیکل 160 سے 174 تک
قومی مالیاتی کمیشن
آڈیٹر جنرل

.....

عدلیہ
آرٹیکل 175 سے 212 تک
عدالتِ عظمیٰ
عدالت ہائے عالیہ
شرعی عدالت

.....

انتخابات
آرٹیکل 213 سے 226 تک اسلامی احکام
آرٹیکل 227 سے 231 تک

.....

ہنگامی احکام
آرٹیکل 232 سے 237 تک

.....

آئین میں ترمیم
آرٹیکل 238 سے 239 تک

.....

ملازمتیں
آرٹیکل 240 سے 243 تک

.....

پبلک سروس کمیشن

.....

مسلح افواج
آرٹیکل 243 سے 245 تک

.....

عام
آرٹیکل 248 سے 280 تک

.....

زبان، جائیداد کا حق اور سیاسی عمل

آئینِ پاکستان کے اندر 280 آرٹیکل (اصل میں 303)، 5 جدول، ابتدائیہ اور ضمیمہ (قراردادِ مقاصد) شامل ہیں۔

انسانی حقوق کا آغاز کب ہوا؟

اُسی دن جب دوسرا انسان روئے زمین پر آیا۔ انسانی حقوق کی پامالی کی کہانی بھی اتنی ہی پرانی ہے۔ قابیل کے ہاتھوں ہابیل کا قتل الہامی کتابوں میں رقم ہے۔ گویا انسان ہی انسان کے حقوق غصب کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ الہامی مذاہب اور دُنیاوی مذاہب اور فکر و فلسفہ کے مباحث کا مرکز و محور حرمت انسانی ہے۔ حضرت موسیٰ کے احکامات ربانی سے لے کر حضرت محمد ﷺ کے آخری خطبہ تک ہمیں حقوق العباد کا ایک مدلّل بیانیہ ملتا ہے۔

انسانی حقوق کی کہانی میں اگر تہذیبی ارتقاء کا پہلو دیکھیں تو جدوجہد "مساویانہ حقوق" کی رہی ہے۔ حمورابی کوڈ میں انسان برابر نظر نہیں آتا۔ غلام کے قتل کی سزا اور طبقہ اشرافیہ کے کسی فرد کی سزا مختلف تھی۔ آقا اور غلام کی تفریق کے مظاہر جابجا ملتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ 10 دسمبر 1948ء اہم ہے کہ اس روز انسانی حقوق کا عالمی منشور منظور ہوا جس میں انسانی برابری کے لیے دستوری اور قانون سازی کی راہیں کھلیں۔ آج یہ دستاویز دنیا بھر میں نمایاں مقام رکھتی ہے۔

اگست 1947ء میں قیام پاکستان کے بعد ہم نے بحیثیت قوم اس دستاویز کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔ اقوامِ متحدہ کے پیرس میں منعقدہ اجلاس میں جب اس دستاویز پر رائے شماری ہوئی تو پاکستان نے حق میں ووٹ دیا۔ پاکستانی وفد میں اس وقت کی رکن دستور ساز اسمبلی بیگم شائستہ اکرام اللہ شامل تھیں۔ سر ظفر اللہ خان نے انسانی حقوق کے منشور کا عقائد کے تناظر میں تجزیہ کرنے کے لیے پوری کتاب لکھ ڈالی۔ پاکستان کا اپنے شہریوں کو بنیادی حقوق دینے کے لیے غور و فکر کا سلسلہ اس سے بھی پہلے اس وقت شروع ہوا جب 12 اگست 1947ء کو دستور ساز اسمبلی نے بانیِ پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کی سربراہی میں شہریوں کے بنیادی حقوق کے حوالے سے کمیٹی تشکیل دی گئی۔ اس کمیٹی کی رپورٹ کی بنیاد پر پاکستان کے دستوری ڈھانچہ کی عمارت تعمیر ہونا تھی۔ اس وقت کے پارلیمانی مباحث بتاتے ہیں کہ اراکین اسمبلی کا نقطہ نظر یہ بنا کہ انسانی حقوق کا عالمی منشور تو ہم مان آئے ہیں۔ اب بتائیے دستور میں اس سے زیادہ کیا دے سکتے ہیں؟ اتنے اچھے آغاز والے ملک میں انسانی حقوق کی جابجا پامالی پر بہت دکھ ہوتا ہے۔ 1956 کے دستور میں بنیادی حقوق کا باب شامل تھا جو کہ اسی کمیٹی کی محنت تھی۔ 1962 میں فردِ واحد نے آئین دیا تو حقوق کا باب غائب تھا۔ جب یہ دستور اسمبلی میں آیا تو اس میں پہلی ترمیم حقوق کا باب واپس لائی۔ 1973 کے دستور میں بھی بنیادی حقوق کا باب شامل ہے۔ مارشل لاء اداوار میں کئی عبوری آئینی حکم نامے آئے لیکن بنیادی انسانی حقوق کے باب میں ایک حرف کا اضافہ نہ ہوا۔ 2010 میں اٹھارویں ترمیم نے منصفانہ سماعت، آزادی اطلاعات اور تعلیم کو حق تسلیم کیا۔ تاہم اگر دستورِ پاکستان کے بنیادی حقوق کے باب کا مطالعہ کریں تو یہ بہت زیادہ "اگر"، "مگر"، قانون، عوامی اخلاقیات وغیرہ کے بوجھ تلے دبا ہے۔ کیا ہم اس باب کو متحرک اور لازمی عمل کی زبان میں نہیں ڈھال سکتے؟

جب دستور معطل ہوتا ہے تو سب سے پہلے یہ باب غیر فعال ہو جاتا ہے۔ کیا ہم اس باب کو اس غیر فعالیت کے عذاب سے مبّرا نہیں کر سکتے؟ پارلیمان نے دستور کے ذریعہ بنیادی حقوق کے باب کے علاوہ قانون سازی کے ذریعے کئی اداروں کو بھی جنم دیا ہے جن میں قومی کمیشن برائے انسانی حقوق، کمیشن برائے حقوقِ نسواں اور کمیشن برائے حقوقِ اطفال شامل ہیں مگر بدقسمتی یہ ہے کہ یہ کمیشن آج غیر فعال ہیں۔ عدالتِ عظمیٰ نے انسانی حقوق کا سیل بنا رکھا ہے۔ انتظامیہ کی وزارت برائے انسانی حقوق بھی قائم ہے لیکن ہم انسانی حقوق کے ثمرات اور اُس ثقافت سے محروم ہیں جس میں عوام کو یہ تمام حقوق حاصل ہوں۔ عدلیہ کے کئی اہم فیصلے بھی آئے خصوصاً اقلیتوں کے حوالے سے۔ لیکن لگتا ہے ہم نے عمل نہ کرنے کی قسم کھا رکھی ہے۔ انسانی حقوق کا دن منانے کا سب سے اچھا انداز یہ ہوسکتا ہے کہ ہم عزم کریں کہ ہمارے لوگ ہی ہمارے لیے سب سے زیادہ اہم ہیں اور ہم انہیں تمام حقوق کے پھل پہنچائیں گے۔

آئینِ پاکستان
بنیادی حقوق کا تجزیہ

آئینِ پاکستان میں دیے گئے بنیادی حقوق کے مطالعہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ 24 بنیادی حقوق میں سے زیادہ تر مکمل اور غیر مشروط نہیں ہیں بلکہ بہت سارے مجرد اور خیالی محسوس ہوتے ہیں۔ اکثر کی زبان بھی غیر واضح اور ٹھوس ضمانتوں سے عاری ہے۔ کم از کم 13 بنیادی حقوق ایسے ہیں جن میں درج ہے کہ یہ حق قانون مطابق، معقول پابندیوں یا وضع کردہ ضابطوں کے مطابق میسر ہوں گے۔

پانچ بنیادی حقوق جن میں آرٹیکل 14- شرفِ انسانی قابلِ حرمت ہوگا، آرٹیکل 20- مذہب کی پیروی اور مذہبی اداروں کے انتظام کی آزادی، آرٹیکل 22- مذہب وغیرہ کے بارے میں تعلیمی اداروں سے متعلق تحفظات، آرٹیکل 24-حقوق جائیداد کا تحفظ اور آرٹیکل 25 (الف) تعلیم کا حق شامل ہیں قانون مطابق ہی حاصل ہوں گے۔ یعنی ا؟ن حوالوں سے باقاعدہ قانون سازی کی جائے گی۔

اِسی طرح چھ بنیادی حقوق میں درج ہے کہ یہ حقوق قانون مطابق معقول پابندیوں سے مشروط ہوں گے۔ ان میں آرٹیکل 15-نقل وحرکت وغیرہ کی آزادی، آرٹیکل 16- اجتماع کی آزادی، آرٹیکل 17- انجمن سازی کی آزادی، آرٹیکل 19- تقریر وغیرہ کی آزادی، آرٹیکل 19 (الف) حق؟ معلومات اور آرٹیکل 23- جائیداد سے متعلق حکم شامل ہیں۔ جبکہ آرٹیکل 18 جو کہ تجارت، کاروبار یا پیشے کی آزادی کے بارے میں ہے وہ قانون مطابق ضابطوں سے مشروط ہے۔ ایک اور زاویے سے اگر آئین پاکستان میں درج بنیادی حقوق کو دیکھا جائے تو 5 حقوق حفاظتی نوعیت کے ہیں جن میں آرٹیکل 8- بنیادی حقوق کے منافی قوانین کالعدم ہوں گے، آرٹیکل 9- فرد کی سلامتی، آرٹیکل 10- گرفتاری اور نظر بندی سے تحفظ، آرٹیکل 10 (الف) منصفانہ سماعت کا حق، اور آرٹیکل 28- زبان، رسم الخط اور ثقافت کا تحفظ شامل ہیں۔ ایک حق یعنی آرٹیکل 11- غلامی، بیگار وغیرہ کی ممانعت سے روکنے والے حقوق کے زمرے میں آتا ہے۔ پانچ حقوق

کا تعلق آئین سے غداری سے ہے۔ اس کا اطلاق 23 مارچ 1956ء سے ہوتا ہے، آرٹیکل 13- دوہری سزا اور اپنے کو ملزم گردانے کے خلاف تحفظ، آرٹیکل 14- شرفِ انسانی قابلِ حرمت ہوگا، آرٹیکل 21- کسی خاص مذہب کی اغراض کے لیے محصول لگانے سے تحفظ اور آرٹیکل 22- مذہب کے بارے تعلیمی اداروں سے متعلق تحفظات شامل ہیں۔

اسی طرح، کم از کم چھ حقوق ایسے ہیں جن مین قانونی امر/کاروائی کی اجازت اور استحقاق کے دعوے ہیں۔ ان حقوق میں آرٹیکل 15- نقل و حرکت کی آزادی، آرٹیکل 16- اجتماع کی آزادی، آرٹیکل 17- انجمن سازی کی آزادی، آرٹیکل 19- تقریر کی آزادی، آرٹیکل 19 (الف)- حقِ معلومات شامل ہیں۔ جبکہ 4 حقوق میں معاشی تناظر میں استحقاق کی بات کی گئی ہے۔ اس صف میں آرٹیکل 18- تجارت، کاروبار یا پیشے کی آزادی، اور آرٹیکل 23- جائیداد کا تحفظ اور آرٹیکل 27- ملازمتوں میں امتیاز کے خلاف تحفظ شامل ہیں۔ بنیادی حقوق کے بارے میں ایک حق کا تعلق مذہبی آزادی سے ہے۔ آرٹیکل 20- مذہب کی پیروی اور مذہبی اداروں کے انتظام کی آزادی فراہم کرتا ہے۔

اسی طرح آرٹیکل 25- شہریوں سے مساوات اور آرٹیکل 26- عام مقامات میں داخلہ سے متعلق عدم امتیاز کو ریاست کی جانب سے مثبت دستوری قرار کہا جاسکتا ہے۔

یہاں یہ تذکرہ بے جانہ ہوگا کہ بنیادی حقوق کے باب میں آرٹیکل 11 (3) جو کہ غلامی، بیگار وغیرہ کی ممانعت کرتا ہے کہتا ہے کہ چودہ سال سے کم عمر کے کسی بچے کو کسی کارخانے یا کان یا دیگر پُرخطر ملازمت میں نہیں رکھا جائے گا جبکہ اسی باب کا آرٹیکل 25 (الف) تعلیم کا حق کہتا ہے کہ ریاست پانچ سے سولہ سال تک کی عمر کے تمام بچوں کو قانون مطابق طریقہ کار کے ذریعے مفت اور لازمی تعلیم فراہم کرے گی۔

حکمتِ عملی کے اصول

آئین کے درجن بھر آرٹیکل (29 تا 40) حکمتِ عملی کے اصولوں کے طور پر ہیں۔ یہ تمام آرٹیکل شہریوں کے سیاسی، سماجی، ثقافتی اور معاشی حقوق سے متعلق ہیں۔ اگرچہ آرٹیکل 29 مملکت کے ہر شعبے اور ہیت ہائے مجاز کو اپنے کارہائے منصبی ان اصولوں کے مطابق نبھانے کا کہتا ہے، تاہم اسی آرٹیکل میں ہے کہ "جہاں تک حکمتِ عملی کے کسی مخصوص اصول پر عمل کرنے کا انحصار اس غرض کے لیے وسائل کے میسر ہونے پر ہو تو وہ اصول ان وسائل کی دستیابی سے مشروط تصور کیا جائے گا۔" دکھ کی بات یہ ہے کہ حکمتِ عملی کے زیادہ تر اصولوں پر وسائل کی عدم دستیابی کا بہانہ بنا کر ریاست نے وہ کام نہیں کیے جن کا یہ اصول حکم دیتے ہیں۔

اسی طرح، یہ آرٹیکل کہتا ہے کہ صدرِ مملکت ہر سال وفاقی حکومت کی ان اصولوں پر عملدرآمد کی رپورٹ مجلسِ شوریٰ (پارلیمان) کے ہر ایک ایوان (سینٹ آف پاکستان اور قومی اسمبلی آف پاکستان) کے سامنے رکھیں۔ جبکہ صوبائی گورنر اپنے صوبے کے حوالے ایسی رپورٹ صوبائی اسمبلی کے سامنے رکھیں گے۔

آئین کی منشاء یہ تھی کہ ان رپورٹوں پر سینٹ اور اسمبلیوں میں بحث ہوگی۔ ایسا فقط ایک بار سینٹ آف پاکستان میں ہوا جبکہ برسوں یہ رپورٹیں پیش ہی نہیں کی جاتیں۔ سندھ اور بلوچستان میں آجتک ایسی کوئی رپورٹ پیش نہیں کی جاسکی۔

انسانی حقوق کا ارتقاء انسانی دانش اور شعور کی اجتماعی میراث ہے۔ تہذیبی سفر میں مختلف معاشروں میں بل آف رائٹس کی صورت میں دستاویزات سامنے آئیں تو بعض ممالک میں یہ سفر پارلیمانی اداروں میں طے ہوا۔ بنیادی حقوق کا تصور انسانی حقوق کے سمندر سے چنے ہوئے وہ حقوق ہیں جو ممالک اپنے آئین میں لکھ کر شہریوں کو یہ ضمانت دیتے ہیں کہ اگر یہ حق نہ ملے تو عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا جاسکتا ہے۔

پاکستان کی آئینی اسکیم میں بنیادی حقوق کی فراہمی یقینی بنانا ریاست کی ذمہ داری ہے۔ آئین کے آرٹیکل 7 میں ریاست کی تعریف بنیادی حقوق کے باب میں کچھ اس طرح کی گئی ہے۔ "تاوقتیکہ سیاق وسباق سے کچھ اور مفہوم نہ نکلتا ہو، مملکت سے وفاقی حکومت، مجلسِ شوریٰ (پارلیمان) کوئی صوبائی حکومت، کوئی صوبائی اسمبلی اور پاکستان میں ایسی مقامی ہیت ہائے مجاز مراد ہیں جن کو ازروئے قانون کوئی محصول یا چونگی عائد کرنے کا اختیار حاصل ہو۔" گویا بنیادی حقوق کی فراہمی وفاقی، صوبائی اور مقامی سطح کی تمام حکومتوں اور پارلیمانی اداروں کی ذمہ داری ہے۔

بنیادی حقوق کے باب میں جو پہلا حق تسلیم کیا گیا ہے وہ ہے "بنیادی حقوق کے نقیض یا منافی قوانین کالعدم ہوں گے۔" اس طرح رسم و رواج کے نام پر بنیادی حقوق نہیں چھینے جاسکتے۔ آئین بناتے وقت جدول اوّل کے جصہ دوئم میں 39 وفاقی اور 7 صوبائی قوانین، آرڈیننس، صدارتی حکم نامے اور ضابطوں کی فہرست دی گئی جن کا دو سال میں جائزہ لے کر انہیں بنیادی حقوق کے مطابق ڈھالنا تھا۔ اس حتمی تاریخ (Deadline) میں فقط چھ ماہ تک توسیع ہوسکتی تھی۔ تاریخی اعتبار سے یہ کام 1976 میں قومی اسمبلی نے مکمل کیا اور بعد ازاں سینٹ آف پاکستان کی منظوری کے بعد 26 اپریل 1976ء کو بنیادی حقوق سے مطابقت (قوانین میں ترامیم) ایکٹ وفاقی دارالحکومت منظور کیا گیا اور چار قوانین کو بنیادی حقوق کے مطابق بنایا گیا۔

آرٹیکل 8 یہ بھی کہتا ہے کہ مملکت کوئی ایسا قانون وضع نہیں کرے گی جو بایں طور عطا کردہ حقوق کو سلب یا کم کرے اور ہر وہ قانون جو اس شق کی خلاف ورزی میں وضع کیا جائے اُس خلاف ورزی کی حد تک کالعدم ہوگا۔ تاہم، یہ بات پرکھنے کا حق عدالت کے پاس تھا۔ 2012ء میں قیام میں آنے والے قومی کمیشن برائے انسانی حقوق ایکٹ میں کمیشن کے دیگر کارہائے منصبی کے ساتھ یہ بات بھی شامل تھی کہ کمیشن انسانی حقوق کے تحفظ کے لیے اسلامی جمہوریہ پاکستان کے دستور یا فی الوقت نافذ العمل کسی بھی دیگر قانون کے تحت یا کسی بھی جانب سے فراہم کردہ تحفظات پر نظر ثانی کرے گا اور نئے قانون سازی کے انتخاب، موجودہ قوانین کی ترمیم کی سفارش کرے گا اور اس پر عملدرآمد یا ترمیم کی خاطر انتظامی اقدامات کرے گا۔"

اس حوالے سے شرط یہ رکھی گئی کہ اس کام کے لیے درخواست حکومت کرے گی اور کمیشن کسی بھی قانون سازی کی جانچ پڑتال کرسکے گا اور اس پر نقطہ نظر دے گا اور قانون سازی کے لیے اس کے مفہوم میں رائے دے گا۔

اس کو ایک اہم پیش رفت قرار دیا جاسکتا ہے اگرچہ ابھی تک اس راستے کا حکومت نے انتخاب نہیں کیا۔

وفاقی وصوبائی سطح پر بنیادی حقوق کا نظام

نظم ونسق کی سطح	انسانی حقوق کے قوانین	ادارے	پارلیمانی طریق کار	عدلیہ
وفاق	قومی کمیشن برائے انسانی حقوق-2012 قومی کمیشن برائے حقوق اطفال قومی کمیشن برائے حقوق نسواں	وفاقی وزارت برائے انسانی حقوق بین الاقوامی معاہدوں پر عملدرآمد کا سیل	فنکشنل کمیٹی برائے انسانی حقوق- سینٹ قائمہ کمیٹی برائے انسانی حقوق- قومی اسمبلی	انسانی حقوق کا سیل
پنجاب	.....	وزارت برائے انسانی حقوق و اقلیتی امور	قائمہ کمیٹی	انسانی حقوق چوکسی سیل
سندھ	سندھ تحفظ انسانی حقوق ایکٹ 2011	وزارت قانون، پارلیمانی امور اور انسانی حقوق	قائمہ کمیٹی	
خیبر پختونخواہ	خیبر پختونخوا انسانی حقوق فروغ تحفظ اور نفاذ ایکٹ-2014	وزارت قانون، پارلیمانی امور و انسانی حقوق	قائمہ کمیٹی	انسانی حقوق سیل
بلوچستان	.....	وزارت برائے سماجی بہبود، خصوصی تعلیم اور انسانی حقوق	قائمہ کمیٹی	

گلگت بلتستان خودمختاری آرڈر 2009 میں بنیادی حقوق کا باب ہے۔

آزاد جموں وکشمیر کے عبوری آئین 1974 میں بھی بنیادی حقوق کا باب ہے۔

خالق کی تخلیق میں ادھورا پن تلاش مت کیجیے

طاہرہ سید

افسوس ناک صورت حال تو یہ ہے کہ ہمارا یہ مہذب معاشرہ خواجہ سراؤں کو سکون سے بھیک مانگنے کا حق بھی نہیں دیتا اور انہیں جبری طور پر جنسی کاروبار میں دھکیل دیا جاتا ہے

پدرسری نظام یا مادرسری نظام؟ نہیں نہیں پدرسری نظام کی جڑیں تو اس معاشرے میں بہت گہری ہیں اسے ختم نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ہم اپنے حقوق لے کر رہیں گے، آنے والا وقت مادرسری نظام کا ہے، کوئی ہمیں ہمارے حقوق لینے سے نہیں روک سکتا۔ پھر ایک اور آواز ابھرتی ہے کہ نہیں جناب یہ دونوں ہی نظام معاشرے کے لیے بہت ضروری ہیں۔ مرد اور عورت اس معاشرے کا اٹوٹ انگ ہیں اس لیے دونوں کو برابر کے حقوق ملنے چاہییں۔ ایسی بہت سی آوازیں ہم انسانی تہذیب کے آغاز سے سنتے چلے آ رہے ہیں۔ فی زمانہ تحریک نسواں اپنے زوروں پر ہے اور خواتین اپنے بہت سے حقوق منواتی نظر آ رہی ہیں۔ بے شمار شعبہ ہائے زندگی میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا کر نہ صرف اپنے جینے کا ڈھب تبدیل کر چکی ہیں بلکہ ماضی قریب میں مردوں کے لیے مخصوص سمجھے جانے والے شعبہ جات میں بھی بہترین کارکردگی دکھا رہی ہیں۔ پاکستان میں اس کی ایک بہترین مثال پاک فضائیہ میں جنگی جہازوں کی اڑان جیسے خالص مردانہ شعبہ تک خواتین کی رسائی ہے۔ اس ضمن میں کئی نئے قوانین بھی مرتب کر لیے گئے ہیں، جن کی رو سے خواتین نہ صرف اپنے حقوق حاصل کر پاتی ہیں بلکہ اپنے ساتھ ہونے والی کسی بھی جنسی زیادتی یا صنفی امتیاز کی صورت میں قانونی چارہ جوئی کا حق بھی حاصل کر چکی ہیں۔

اس تمام صورتحال کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد ہمارے معاشرے کے بہت سے لوگ سینہ چوڑا کر کے یہ بات کہتے ہوں گے کہ جی ہاں، آج ہمارے معاشرے میں بہت سی مثبت تبدیلیاں آ رہی ہیں۔ یہ بات کہتے ہوئے ایک بار پھر غور کریں، کیا واقعی ہمارے معاشرے میں تمام اصناف کو یکساں حقوق حاصل ہو گئے ہیں؟ کیا واقعی اس معاشرے نے سب کو یکساں قانونی حقوق دے دیے ہیں؟ کیا آپ کو یقین ہے کہ اس معاشرے میں تمام اصناف کو آگے بڑھنے کے یکساں مواقع حاصل ہیں؟

ہماری اکثریت یقیناً مردوں اور عورتوں کے درمیان ہونے والی بحث اور حقوق و فرائض کی جنگ کا جائزہ لے کر یہ بات طے کرنے کی کوشش کرے گی کہ کون حقوق حاصل کر چکا اور کس کو ابھی مزید اپنے حقوق حاصل کرنے ہیں لیکن کیا کبھی ہم نے سوچا کہ ہمارے معاشرے کا ایک اور طبقہ بھی ہے جنہیں ہم خواجہ سرا تو شاید ہی کبھی بولتے ہوں، اس سے ہٹ کر بہت سے تضحیک آمیز ناموں سے ضرور نوازتے رہتے ہیں۔ سڑکوں پر جا بجا رنگ برنگے کپڑے پہنے گھومتے پھرتے، بھیک مانگتے خواجہ سرا اکثر و بیشتر ہر ایک کی تضحیک اور مذاق کا نشانہ بنتے نظر آتے ہیں۔ نوجوانوں سے لے کر بوڑھوں تک، ہر عمر کے لوگوں کے ہاتھوں جنسی درندگی سمیت ہر قسم کے مذاق کا نشانہ بنتی یہ مخلوق جنہیں ہم شاید انسانیت کے درجے پر فائز ہی نہیں کرتے۔

آپ کو یہ جان کر شاید حیرت ہو کہ یہ طبقہ جنہیں ہم انسان سمجھنا گوارہ نہیں کرتے انتہائی حساس طبیعت کا مالک ہے اور ایک تحقیق کے مطابق دنیا میں 41 فیصد خواجہ سرا اپنی زندگی میں خودکشی کی کوشش ضرور کرتے ہیں۔ نفسیاتی امراض کے ماہرین کے مطابق انسانوں کے ذہنی امراض کی وجوہات میں اس معاشرے کی طرف سے ٹھکرایا جانا، آگے بڑھنے کے مواقع کا نہ ہونا، جنسی تشدد اور معاشرے کا امتیازی سلوک سرِفہرست ہیں۔ جو ایک خواجہ سرا کے لیے ہر دن کا منظر نامہ ہے۔ روزانہ کی بنیاد پر اس معاشرے کی طرف سے انتہائی نفرت انگیز سلوک انہیں مختلف بیماریوں کی طرف دھکیل دیتا ہے اور پھر 'مرے پہ سو دُرّے' کے مترادف معاشرے کی یہ ٹھکرائی ہوئی مخلوق ہسپتالوں میں بھی قابلِ ذکر توجہ اور علاج کی سہولیات حاصل کرنے سے محروم رہتی ہے۔ یہ لوگ اپنے گھروں سے اپنے خاندان سے دور آپس میں مل کر رہتے ہیں۔ انہیں اپنے خاندان سے کسی بھی قسم کی اخلاقی یا مالی طور پر حمایت حاصل ہونا تو دور کی بات انہیں ایک بدنما داغ تصور کیا جاتا ہے۔ لہٰذا ان بدنما رویوں کو سہتے سہتے یہ بچے گھروں سے بھاگ جاتے ہیں یا پھر گھر والے انہیں خود ہی جانے کا کہہ دیتے ہیں۔ خاندان کی مدد کے بغیر تعلیم حاصل کرنا یا کسی ہنر کا سیکھنا ناممکن سی بات ہے اس صورتحال میں بھیک مانگنا ان کے پاس واحد حل ہوتا ہے۔

افسوس ناک صورت حال تو یہ ہے کہ ہمارا یہ مہذب معاشرہ انہیں سکون سے بھیک مانگنے کا حق بھی نہیں دیتا اور انہیں جبری طور پر جنسی کاروبار میں دھکیل دیا جاتا ہے۔ معاشرے کی یہ ٹھکرائی ہوئی مخلوق محض ہمارے لیے 'تفننِ طبع' کا ذریعہ ہی بنتی ہے۔ اور ان کی اس تذلیل کو ہم اپنے قہقہوں میں اڑاتے ہوئے شاید ہی کبھی ان کے محسوسات کا سوچتے ہوں۔ البتہ یہ سستی تفریح اور گھٹیا مذاق ہمیں ہمارے انسان ہونے کے درجے سے ضرور گرا دیتے ہیں۔ انسانیت کے تقاضے نبھاتے ہوئے اپنے حقوق کی جنگ میں فرائض کا ادراک بھی معنی رکھتا ہے۔ معاشرے کا اس حد تک اخلاقی دیوالیہ نکل چکا ہے کہ خواجہ سراؤں کا نام کسی کو گالی دینے یا کسی کی مردانگی کو للکارنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن صنفی آزادی اور صنفی برابری کے نعروں میں ان کا نام کہیں نہیں آتا۔ اور نہ ہی انہیں باہر نکل کر اپنے حقوق کی جنگ لڑنے کا حق دیا جاتا ہے۔ ایک کچلے ہوئے طبقہ کے سروں پر کھڑے ہو کر اپنے تہذیب یافتہ ہونے کا اعلان کرتا یہ معاشرہ انسانیت کے درجے پر فائز ہونے کا حق بھی نہیں رکھتا۔

تاریخ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ماضی میں بھی مختلف انسانی معاشروں نے رنگ اور نسل کی بنیاد پر نا صرف اچھائی برائی کے معیارات قائم کیے بلکہ ایک دوسرے کے حقوق ڈنکے کی چوٹ پر غصب کیے۔ ان تہذیب یافتہ معاشروں میں انسانوں نے اپنے جیسے دوسرے انسانوں کو صرف رنگ کی بنیاد پر غلامی کی زنجیروں میں جکڑا لیکن وقت کے ساتھ ساتھ شعور نے آگہی کی منزلیں طے کیں اور بالآخر غلامی کا ادارہ تو اپنا وجود کھو بیٹھا لیکن انسانی شعور اتنا پختہ پھر بھی نہ ہوا کہ رنگ، نسل اور صنف کی تقسیم سے آزاد معاشرہ قائم ہو پاتا۔ عالمی انسانی حقوق کی بے شمار تنظیمیں سرگرمِ عمل تو نظر آتی ہیں لیکن ہماری نگاہیں فی الحال معاشرے پر ان سرگرمیوں کا کوئی دیرپا اثر دیکھنے سے قاصر ہیں۔

دنیا کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ جب جب کسی طبقے یا گروہ کو طاقت اور برتری کے زعم میں کچلا گیا تو اس طبقے سے چند نام ضرور ایسے اٹھے جن کو رہتی دنیا تک یاد رکھا جائے گا۔ اس تناظر میں پاکستان کے خواجہ سراؤں نے بھی ایسے نام پیدا کیے جو دوسروں کے لیے یقیناً مشعلِ راہ ہیں۔ حال ہی میں جولی اعوان نامی ایک پاکستانی خواجہ سرا کے خیالات جاننے کا موقع ملا جو کہ پوری دنیا میں اپنے طبقے کی نا صرف نمائندگی کر چکی ہیں بلکہ ہر فورم پر اپنے حقوق کے لیے آواز بھی اٹھاتی رہتی ہیں۔ انتہائی بہادری کے ساتھ اتنے نامساعد حالات میں اپنے حقوق کی جنگ لڑنے کے علاوہ اپنے ساتھیوں کی فلاح و بہبود کے کام بھی جاری رکھے ہوئے ہیں۔

اسی طرح اسی طبقے کا ایک اور چمکتا ستارہ ببلی ملک ہیں جنہوں نے اپنی محنت اور لگن سے یہ ثابت کیا کہ خواجہ سرا بغیر ناچ گانا دکھائے عام لوگوں کی طرح محنت کش زندگی بھی گزار سکتے ہیں۔ ببلی ملک انتہائی باصلاحیت اور جی دار خواجہ سرا ہیں جنہوں نے این سی اے میں ایک چھوٹی سی ٹگ شاپ کا آغاز کیا اور بہت سے دوسرے خواجہ سراؤں کو ملازم رکھ کر اُن کے لیے روزگار کا ذریعہ بنیں لیکن ہمارے معاشرتی اصولوں کے ٹھیکیداروں کو اُن کی یہ کاوش ایک آنکھ نہ بھائی اور ان کو اپنے تمام ملازمین سمیت بے دخل کر دیا گیا۔ اِس مہذب معاشرے کی طرف سے دیا گیا یہ دھکا انہیں گرا تو نہ سکا البتہ انہیں آگے بڑھانے کا سبب ضرور بنا۔ ببلی ملک کا سفر جاری رہا اور بالآخر ایک تنظیم کی صورت میں سامنے آیا۔ وجود نامی یہ تنظیم ہر محاذ پر خواجہ سراؤں کے وجود کی جنگ لڑ رہی ہے۔

اِسی مظلوم کچلے ہوئے طبقے کا ایک اور چمکتا دمکتا ستارہ عائشہ مُغل نامی خواجہ سرا ہیں جنہوں نے حقیقی معنوں میں یہ ثابت کیا کہ 'ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی'۔

عائشہ مُغل وہ پہلی خواجہ سَرا ہیں جنہوں نے سرکاری وفد کا حصہ بن کر بین الاقوامی سطح پر پاکستان کی نمائندگی کی۔ جنیوا میں ہونے والے یو این کنونشن کے پلیٹ فارم سے صنفی مساوات کے حوالے سے آواز اٹھائی۔ عائشہ مُغل کی جدوجہد کچھ اس طرح رنگ لائی کہ پاکستان میں خواجہ سَرا طبقے کے حقوق کے حوالے سے باقاعدہ قانون سازی کی گئی جس کا سہرا یقیناً عائشہ مُغل کے سر جاتا ہے۔ اِس تمام قانون سازی کے عمل میں اُن کا کردار کلیدی رہا۔

بلوچستان کو بھی بالآخر تصویر مل گئی

وسعت اللہ خان

اگر ہم بیسویں صدی کے تیسرے عشرے کی ہسپانوی خانہ جنگی کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے تو کوئی بات نہیں۔ پکاسو کی پینٹنگ گورنیکا دیکھ لیں یا پھر وہ فوٹو جس میں جنرل فرانکو کے فاشسٹ فائرنگ سکواڈ کے سامنے ہسپانوی شاعر و ڈرامہ نگار فیدریکو گارسیا لورکا موت سے چند سیکنڈ پہلے سینہ تانے نعرہ زن کھڑے ہیں۔ آپ کو سب سمجھ میں آجائے گا کہ دراصل سپین پر کیسی سفاکی ٹوٹی ہوگی۔

ہٹلر نے کنسنٹریشن کیمپوں میں یہودیوں کے ساتھ کیا کیا۔ اس کی داستان اس ایک تصویر میں سمٹ کر رہ گئی جس میں قیدیوں کے دھاری دار یونیفارم پہنے بیسیوں یہودی مردوں، عورتوں اور بچوں کے زندہ ڈھانچے خاردار تاروں کے دوسری جانب کھڑے آزادی کے منتظر ہیں۔

ویتنام کی جنگ کتنی تباہ کُن تھی۔ ہزاروں میل پرے ڈرائنگ روموں میں ٹی وی کے رُوبرُو بیٹھ کر اس کا ہرگز اندازہ نہ ہوتا اگر مائی لائی نامی دیہات پر امریکی نیپام بموں کی بارش سے دہشت زدہ بھاگتے عریاں بچوں کی تصویر سامنے نہ آتی۔ اس ایک تصویر نے اس جنگ کے خلاف عالمگیر مظاہروں کو ایڑ لگا دی۔

قرنِ افریقہ میں اُنیس سَو اَسّی کی دہائی میں خوفناک قحط پڑا۔ اُس قحط پر ہزار ہا لفظ لکھے گئے۔ کئی امدادی کنسرٹس بھی ہوئے۔ مگر جنوبی سوڈان کی بس ایک تصویر نے دراصل بتایا کہ قحط ہوتا کیا ہے۔

تصویر میں ایک فاقہ زدہ بچے کا ڈھانچہ آخری سانسیں لے رہا ہے اور قریب بیٹھا ایک بے چین گِدھ یہ سانسیں گِن رہا ہے۔

اُنیس سَو نواسی میں بیجنگ کے تیئن آن من اسکوائر میں کیسی مزاحمت ہوئی۔ اِس کا منظر صرف ایک تصویر میں سمٹ کر آ گیا جس میں ایک نہتا شہری آتے ہوئے ٹینکوں کی قطار کے سامنے کھڑا ہے۔

شام کی خانہ جنگی میں انسان پر کیا قیامت گذر گئی۔ اس بارے میں بیسیوں تصاویر سامنے آئیں۔ مگر ترکی کے ساحل پر چار سالہ شامی بچے ایلان الکردی کی اوندھی پڑی لاش نے دنیا کو ہلا کے رکھ دیا اور یورپ کو شامی پناہ گزینوں کے لئے دروازے کھولنے پڑے۔

کشمیر کے المیے کی تمام تصویریں اگر غائب بھی ہو جائیں تب بھی صرف ایک تصویر کشمیر کا نوحہ بیان کرنے کے لئے کافی ہے۔ سوپور کی ایک سڑک پر ایک تین سالہ بچہ اپنے دادا کی خون آلود لاش کے سینے پر حیران بیٹھا ہے۔

مگر تیرہ اگست کو تربت کی ایک سڑک پر جواں سال حیات بلوچ کو جس طرح مارا گیا اور اس کے والدین جس کیفیت میں لاش پر سایہ فگن ہیں۔ بلوچستان سے نابلد کسی بھی شخص کو پوری کہانی سمجھانے کے لئے یہ تصویر کافی ہے۔ کچھ عرصے پہلے تک امید تھی کہ شاید بلوچستان کا مسئلہ کچھ لو کچھ دو کی بنیاد پر سیاسی انداز میں حل کر لیا جائے گا۔ مگر اس کے لئے دماغ بھی تو سیاسی چاہئے۔ فی زمانہ چہار جانب شلوار قمیض اور واسکٹ پہنے ایسے روبوٹ گھوم رہے ہیں جو ہمدردی کی اداکاری سے بھی نابلد ہیں۔ جن کے ہاتھ میں ہتھوڑا ہے انہیں ہر مسئلہ کیل نظر آ رہا ہے۔

اِس وقت بلوچستان کا سب سے مظلوم طبقہ نہ تو لاپتہ افراد کے لواحقین ہیں اور نہ ہی عدم تحفظ و محرومی سے دوچار نوجوان نسل۔ سب سے قابلِ رحم وفاق نواز بلوچستانی سیاستداں ہیں۔ مگر وفاق نے ان کی سیاسی لاج رکھنے کے بجائے انہیں اپنوں ہی کی نظر میں دھوبی کا کُتا بنا دیا۔

نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن میں جکڑا یہ وفاق پسند طبقہ کس ذہنی اذیت و خلفشار کی سان پر چڑھا ہوا ہے۔ اس کی ایک جھلک بلوچستان کے گذشتہ وزیرِ اعلیٰ اور عمران خان کے سابق اتحادی اختر مینگل کے قومی اسمبلی سے حالیہ خطاب میں دیکھی جا سکتی ہے۔ فرماتے ہیں،

''کشمیر کے لیے کمیٹیاں بنائی جا رہی ہیں۔ کشمیر تو جب ملے گا تب ملے گا۔ یہ جو ہاتھ سے جا رہا ہے اِس کے لیے تو کوئی کمیٹی بناؤ۔ اِس ایوان میں آٹا، چینی، ٹماٹر تو زیرِ بحث آتا ہے مگر بلوچ کا خون زیرِ بحث نہیں آتا۔ کیا اِس کے خون کا رنگ ٹماٹر سے بھی زیادہ خراب ہے۔ اِسے آپ نے اپنایا ہی نہیں بلکہ کالونی سمجھا ہے۔

اگر افغانستان امن کانفرنس بلائی جا سکتی ہے تو بلوچستان امن کانفرنس کیوں نہیں ہو سکتی؟ یا پھر یوں کریں کہ آئین میں ترمیم کر کے مقبوضہ یا مفتوحہ بلوچستان لکھ دیں۔ اس کے بعد ہمیں آپ سے کوئی شکوہ نہیں رہے گا۔ ہم اپنے لواحقین کو کہہ سکیں گے کہ اپنی لاشیں خاموشی سے دفناتے رہو۔ یہ تم پر خدا کا عذاب ہے اسے سہتے رہو''۔

مجھے اختر مینگل کی یہ تقریر سن کر بنگال کے وفاق پرست ڈاکٹر اے ایم مالک، عبدالمنعم خان، فضل القادر چوہدری، پروفیسر غلام اعظم، عبدالجبار خان، راجہ تری دیورائے، خواجہ خیرالدین، خان عبدالصبور، مولوی فرید احمد، محمود علی، نورالامین وغیرہ یاد آ رہے ہیں۔

(بشکریہ بی بی سی اردو)

شوہر نے بیوی بچوں پر تیزاب پھینک دیا، چاروں شدید زخمی

پشاور حیات آباد میں شوہر نے بیوی بچوں پر تیزاب پھینک دیا، جس کے نتیجے میں بیوی بچوں سمیت شدید زخمی ہوگئی۔ 4 ستمبر 2020ء کو پشاور کے علاقہ حیات آباد میں گھریلو ناچاقی پر شوہر نے اپنی بیوی اور تین بچوں پر تیزاب پھینک دیا، پولیس نے بیٹے کی مدعیت میں باپ کے خلاف مقدمہ درج کرلیا۔ مدعی مقدمہ 12 سالہ منیب نے تھانہ تاتارا میں مقدمہ درج کراتے ہوئے پولیس کو بتایا کہ وہ گزشتہ روز اپنی والدہ اور بہنوں کے ہمراہ گھر میں موجود تھے اس اثناء ان کا والد امتیاز الدین گھر میں داخل ہوا جس کے ہاتھ سیاہ شاپنگ بیگ تھا اور اس میں مائع چیز تھی جو اس نے ہم پر پھینک دی جس کی باعث اس کی والدہ اور بہنیں کے چہرے اور جسم بری طرح جھلس گئے۔ تیزاب پھینکنے کی وجہ والدین کے مابین گھریلو ناچاقی ہے۔ زخمیوں میں سے منیب کو فوری طور پر برن ہسپتال حیات آباد منتقل کر دیا اور اس کی رپورٹ پر تھانہ تاتارا پولیس نے زیر دفعہ 336(B) تعزیرات پاکستان کے تحت مقدمہ درج کرلیا ہے۔

(روزنامہ آج)

لیڈی ہیلتھ ورکر کے مبینہ قتل کے خلاف احتجاج

شمالی وزیرستان پاکستان کے سابقہ قبائلی علاقے شمالی وزیرستان کی تحصیل میرعلی میں ایک احتجاج کیا جارہا ہے۔ اِس احتجاج میں یہاں سے کوسوں دور موجود بہت سے لوگ بھی سوشل میڈیا اکاؤنٹس کے ذریعے شامل ہیں۔ ٹوئٹر پر صارفین کی جانب سے جسٹس فار ناہیدہ کے نام سے ٹرینڈ چلایا جارہا ہے۔ ناہیدہ اِسی علاقے کی مکین ہیں اور اُنھیں 21 ستمبر کو دن دیہاڑے ایک شاہراہ پر نامعلوم افراد نے گولی مار کر قتل کر دیا تھا۔ پولیس ذرائع سے وصول ہونے والی تفصیلات اور ناہیدہ کے والد کی جانب سے درج کرائی گئی ایف آئی آر کے مطابق ناہیدہ گل کی عمر 25 برس تھی اور وہ گذشتہ 2 سال سے میرعلی میں موجود ایک غیر سرکاری ادارے (این جی او) میں نیٹوٹریشن اسسٹنٹ کے فرائض سرانجام دے رہی تھیں۔ ان کا گھر دفتر سے تقریباً آٹھ کلومیٹر کی دوری پر تھا اور وہ صبح آٹھ بجے ایک رکشہ چنگچی کے ذریعے یہ سفر طے کرتی تھیں۔ میرعلی تھانے کے ایس ایچ او کا کہنا ہے کہ اس واقعے کی ایف آئی آر کاؤنٹر ٹیرازم ڈیپارمنٹ والوں کی جانب سے درج کی گئی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ ڈرائیور سے ہونے والی پوچھ گچھ سے معلوم ہوا ہے کہ پیر کو بھی وہ حسبِ معمول آٹھ بجے گھر سے نکلیں۔ ڈرائیور نے پولیس کو بتایا ہے کہ 'واپسی پر دفتر سے ڈیڑھ کلومیٹر کے فاصلے پر دو نقاب پوش چنگچی میں بیٹھے اور ناہیدہ نے کہا کہ پہلے ان کو جدھر یہ کہہ رہے ہیں چھوڑ دیں۔ پھر ہم گھر جاتے ہیں۔ نقاب پوش افراد نے ڈرائیور کو پہاڑی راستے پر جانے کو کہا۔' ایس ایچ او کے مطابق معلوم ہوا ہے کہ مکینے کلے براستہ محمدی کلے کے مقام پر پہنچ کر ایک بندے نے ناہیدہ کو چنگچی سے اتار کر ایک جانب لے جا کر دو گولیاں ماریں جبکہ ڈرائیور کو دوسرا شخص دوسری سمت لے گیا اور اُس پر پستول تان لی۔ ناہیدہ کا گھر مسکی نامی علاقے میں تھا۔ اُن کے والد محمد فاروق خان نے ایف آئی آر اور پولیس کو تفتیش میں بتایا ہے کہ اُن کی بیٹی دو سال سے کام کر رہی تھیں تاہم کبھی بھی کوئی دھمکی موصول نہیں ہوئی اور نہ ہم کسی پر شک کر سکتے ہیں۔ ڈرائیور کے بقول ناہیدہ کو قتل کرنے کے بعد وہ دونوں افراد اس کے ہمراہ واپس اسی روڈ پر لے آئے جہاں سے ہم آئے تھے اور دو کلومیٹر دور جا کر انھوں نے روکا اور پھر غائب ہو گئے۔ ڈرائیور نے بتایا کہ پھر انھوں نے اپنے ایک دوست کے ساتھ جا کر ناہیدہ کی لاش کو اٹھا کر چنگچی میں رکھا اور ہسپتال تک لے کر گئے۔ پولیس کا کہنا ہے کہ یہ واقعہ ساڑھے بارہ سے ایک بجے کے درمیان پیش آیا اور ناہیدہ کی والدہ کو دن ایک بجکر پانچ منٹ پر کال موصول ہوئی کہ آپ کی بیٹی کو قتل کر دیا گیا ہے۔ پولیس کا کہنا ہے کہ یہ ایک حساس علاقہ ہے اور یہاں پولیو کی کوئی مہم نہیں ہو رہی تھی نہ وہاں پولیس موجود تھی۔ 'اگر آپ نے یہ علاقہ دیکھا ہے تو یہ حسوپل سے اور مرکزی شاہراہ سے چھ سے سات کلومیٹر اندر ہے۔'

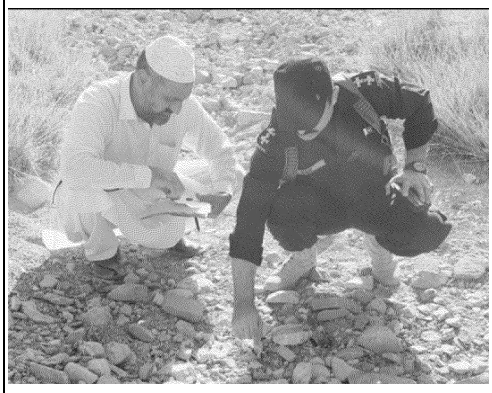

پولیس کے مطابق بظاہر یہ ٹارگٹ کلنگ کا واقعہ ہے تاہم پولیس ابھی ڈرائیور کے فون نمبر کا ریکارڈ چیک کر رہی ہے۔ ایس ایچ او میرعلی کے مطابق اِس واقعے کی تحقیقات سی ٹی ڈی کی ٹیم کر رہی ہے اور اس دوران قبائلی جرگے نے ہمیں آ کر کہا کہ ڈرائیور بے قصور ہے اسے چھوڑ دیا جائے۔ اس واقعے سے متعلق رُکن پارلیمان اور پی ٹی ایم کے رہنما محسن داوڑ نے بھی ٹویٹ کی اور کہا کہ 'اس واقعے سے وزیرستان میں امن اور سکیورٹی سے متعلق بولا گیا جھوٹ سامنے آ گیا ہے۔ طالبان کی دہشت معصوموں کا خون مانگتی ہے۔' انھوں نے الزام عائد کیا کہ 'ریاست اپنی دوغلی چال سے باز نہیں آئی، ہم اسے پہچانتے ہیں اور ہم اس کی مزاحمت کریں گے۔' ایف آئی آر رپورٹ کے مطابق ناہیدہ کی نعش کو پوسٹ مارٹم کے لیے بنوں منتقل کیا گیا۔ ایف آئی آر میں یہ بھی درج ہے کہ اس علاقے میں ٹارگٹ کلنگ کے واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ ویمن ڈیموکریٹک فورم نے دعویٰ کیا ہے کہ گذشتہ چند ماہ میں یہ کسی خاتون کے ساتھ پانچویں بار ہوا ہے تاہم متعلقہ تھانے کے اہلکار نے ان دعووں کی تردید کی۔ گلالئی اسماعیل کہتی ہیں کہ ممکنہ طور پر یہ نامعلوم حملہ آور میرعلی کا وہ مقامی گروہ ہی ہے جو خواتین کو این جی او کے ساتھ کام کرنے سے روک رہا تھا۔ صحافی عاصمہ شیرازی نے اپنی ٹویٹ میں حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ ذمہ داران کو کٹہرے میں لائے۔ عصمت شاہ جہاں نے اس واقعے کی مذمت کی اور لکھا کہ ہمیں اسے روکنا ہوگا۔ واقعے کی مذمت کے علاوہ ایک بڑا سوال سکیورٹی اداروں کی کارکردگی پر بھی اٹھایا جارہا ہے۔ عالم زیب محسود نے ٹویٹ کی اور لکھا کہ عوتوں پر حملوں پہ انھیں تشویش ہے۔ انھوں نے کہا کہ کچھ روز پہلے زیبا صافی کو اس کے گھر کے سامنے گولی ماری گئی اور اب ناہید کا واقعہ پیش آیا ہے۔

(بشکریہ: بی بی سی اردو)

محبوس بچوں کی بازیابی

عمرکوٹ ایڈیشنل سیشن جج کے احکامات کی روشنی میں صالح بھنبورو کی پولیس نے گاؤں ہادی بخش کھوسو، سامارو چھاپہ مار کر دو کمسن بچوں کو اُن کی والد کی غیر قانونی تحویل سے بازیاب کروایا۔ اِن بچوں میں دو سالہ بچی ممتا اور ایک سالہ بچہ لچھمن شامل ہیں۔ بچوں کی والدہ نے عدالت میں درخواست دائر کی تھی کہ اُس کے خاوند باغو کولہی نے اُس کے بچوں کو غیر قانونی طور پر اپنی حراست میں رکھا ہوا ہے جنہیں بازیاب کر کے اِس کے حوالے کیا جائے۔

(اوکھوہل)

بچے کے ساتھ جنسی زیادتی کی مبینہ کوشش

عمرکوٹ 06 ستمبر 2020 کو عمرکوٹ شہر کی پولیس نے ساجن اوڈ کی درخواست پر رفیق نامی شخص کے خلاف ساجن کے بچے کے ساتھ جنسی زیادتی کی کوشش کا مقدمہ درج کیا۔ ساجن نے اپنی درخواست میں مؤقف اختیار کیا تھا کہ رفیق نے اُس کے 12 سالہ بچے نیاز کو جنسی تشدد کا نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی۔ پولیس نے مقدمے کے اندراج کے بعد مختلف مقامات پر چھاپہ مار کر ملزم کی گرفتاری یقینی بنائی۔ مزید تفتیش جاری ہے۔

(اوکھوہل)

خاتون کو زخمی کر دیا گیا

نواب شاہ ضلع شہید بینظیر آباد کے علاقے قاضی احمد کے نواحی گاؤں فقیر محمد جوکھیو میں زرعی زمین کے تنازعے پر خاتون پر کتے چھوڑ دیئے گئے۔ پولیس کے مطابق واقعے میں خاتون زخمی ہوگئی، خاتون کو زخمی حالت میں سول اسپتال قاضی احمد منتقل کر دیا گیا ہے۔ پولیس کے مطابق اپنی زمینوں پر کام کرنے والی خاتون نور بانو پر زمین کے تنازعے پر ملزمان صاحب جوکھیو گلشیر، جوکھیو گل حسن اور جوکھیو ریاض نے کتے چھوڑ دیئے جس کے باعث وہ شدید زخمی ہو کر بے ہوش ہو گئی۔ خاتون کے بیٹے کو اطلاع ملنے پر اُسے سول اسپتال قاضی احمد منتقل کر دیا گیا ہے جہاں پر خاتون کو طبی امداد دی جارہی ہے۔

دوسری جانب زخمی خاتون کے بیٹے محمد حنیف جوکھیو کی مدعیت میں قاضی احمد تھانے پر ابتدائی رپورٹ درج کر لی گئی ہے تاہم قاضی احمد پولیس نے واقعے میں ملوث ملزمان گرفتار نہیں کر سکی ہے۔

(آصف البشر)

4 سال سے لاپتا شخص کی لاش برآمد

چاغی ضلع چاغی کے علاقے پل چھوٹو میں 4 سال سے لاپتا شخص کی گولیوں سے چھلنی لاش برآمد ہوئی۔ متوفی حفیظ اللہ محمد حسنی کو چار سال قبل دالبندین سے اغوا کیا گیا تھا اور جس کے بعد سے اُن کے بارے میں معلومات نہیں تھیں۔ حفیظ اللہ کے مبینہ طور پر لاپتا ہونے کے بعد گمشدہ افراد کے لیے آواز اٹھانے اور ان کی محفوظ بازیابی کا مطالبہ کرنے کے لیے وائس فار بلوچ مسنگ پرسنز کی جانب سے منعقدہ احتجاجی مظاہروں میں اُن کے اہلخانہ نے بھی متعدد مرتبہ شرکت کی تھی۔ خاندانی ذرائع کے مطابق حفیظ اللہ کی لاش کو اُس کے قتل کے بعد ایک ویران جگہ پر دفن کیا گیا تھا۔ قریبی گاؤں کے رہائشیوں نے قبائلی عمائدین کو علاقے میں نامعلوم لاش کی موجودگی کی اطلاع دی جسے بعد میں دالبندین کے پرنس فہد ہسپتال منتقل کر دیا گیا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ فرنٹیئر کور 'دالبندین رائفلز' کے ایک بڑے عہدے دار کو گزشتہ سال اگست میں ایک فوجی عدالت نے حفیظ اللہ کی بازیابی کے وعدے پر متاثرہ شخص کے اہلِ خانہ سے 60 لاکھ روپے رشوت لینے کے الزام میں عمر قید کی سزا سنائی تھی۔ یاد رہے کہ متاثرہ اہل خانہ نے افسر کے خلاف وعدہ پورا نہ کرنے کی شکایت درج کروائی تھی۔

پرنس فہد ہسپتال کے ڈاکٹر اقبال بلوچ نے ڈان کو بتایا کہ لاش 3 سال پرانی ہونے کی وجہ سے شناخت کے قابل نہیں ہے۔ تاہم انہوں نے کہا کہ حفیظ اللہ کے اہلخانہ نے اسے کپڑے پر بنے درزی کے ٹیگ سے پہچانا جبکہ اس کے علاوہ اس کے دو مصنوعی دانت اور جوتوں نے بھی حفیظ اللہ کی شناخت کرنے میں مدد کی۔ ڈاکٹر اقبال بلوچ کے مطابق لاش کے طبی معائنے کے دوران اس کے سینے پر تین اور ایک ٹانگ پر گولیوں کے نشانات ملے ہیں۔ لیویز فورس کے عہدیداروں نے معاملے کی تحقیقات کا آغاز کر دیا ہے۔

(بشکریہ ڈان)

شاہینہ شاہین کے قاتلوں کو گرفتار کیا جائے

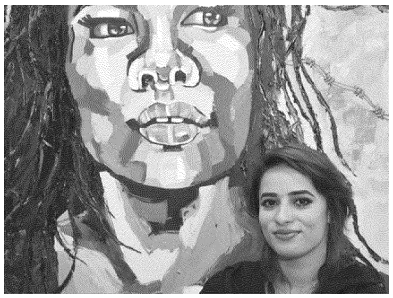

تربت مکران پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق کی ٹاسک فورس تربت مکران کی جانب سے کمیشن کے کوآرڈینیٹر غنی پرواز کی سربراہی میں ایک پانچ رکنی ٹیم نے 8 ستمبر 2020 کو شاہی تمپ جا کر محترمہ شاہینہ شاھین کے قتل پر اُن کی والدہ مہرنگ ماھیکان، ماموں امجد رحیم اور دیگر قریبی خواتین وحضرات سے تعزیت کی، اور پھر ایک پریس ریلیز جاری کی۔ ایچ آر سی پی ریجنل آفس تربت مکران کی پریس ریلیز میں محترمہ شاہینہ شاھین کو ایک قومی سرمایہ قرار دے کر اُنہیں خراجِ عقیدت پیش کیا گیا، جبکہ اُن کے المناک قتل پر دلی افسوس کا اظہار کیا گیا ہے، اور قتل کی شدید مذمّت کرتے ہوئے قاتلوں کی فوری گرفتاری اور قرار واقعی سزا کا پُرزور مطالبہ کیا گیا۔ ایچ آر سی پی ریجنل آفس تربت مکران کی پریس ریلیز میں کہا گیا ہے کہ محترمہ شاہینہ شاھین ایک باکمال مصوّرہ، ادیبہ، صحافی، انسانی حقوق کی کارکن اور خواتین تحریک کی کارکن تھیں۔ چاہیے تو یہ تھا کہ اُنہیں عزت، حیثیت، درجہ اور انعامات سے نوازا جاتا۔ مگر بدقسمتی سے اُن کے جنونی شوہر اُن کی قدر و منزلت نہ جان سکے، جس کی بناء پر اکیلے یا کسی کے ساتھ مل کر اور امکان غالب یہی ہے کہ اپنے کسی دوست کے ساتھ مل کر اُنہیں وحشیانہ طور پر قتل کر دیا، اور اپنے ساتھی سمیت فرار ہو گیا۔ جس پر جتنے بھی دلی رنج و افسوس کا اظہار کیا جائے کم ہے، اور قتل اور قاتلوں کی جتنی بھی مذمّت کی جائے کم ہے۔

محترمہ شاہینہ شاہین نے انسانی حقوق کا کام عورتوں کے حقوق کے لیے آواز اٹھا کر شروع کیا۔ چند برس قبل اُنہوں نے بعض ہم خیال خواتین کے ساتھ مل کر تربت میں ''دزگہار'' کے نام سے خواتین کی ایک تنظیم بنائی اور اُس کے پلیٹ فارم پر بہت سی تعلیم یافتہ اور قابل خواتین کو متحد کر کے خواتین کے مساویانہ حقوق کی تحریک کی بنیاد رکھی، اور اِس مقصد کے لئے انہوں نے کئی پروگرام منعقد کیے اور ساتھ ہی ساتھ اس تحریک کو بہتر طور پر آگے بڑھانے کی خاطر تنظیم کے ترجمان کے طور پر ماہنامہ ''دزگہار'' کا اجرا کیا جس میں لکھاری خواتین کی مختلف قسم کی تخلیقات شائع ہوتی رہیں۔ پھر اُنہوں نے کوئٹہ جا کر بلوچستان یونیورسٹی کے فائن آرٹ ڈیپارٹمنٹ میں داخلہ لیا۔ اور فرسٹ پوزیشن میں گریجویشن کی ڈگری حاصل کر لی۔ اُسی دوران اُن کے آرٹ کی کئی نمائشیں بھی ہوئیں اور وہ پی ٹی وی بولان میں کام کرنے لگیں اور اُس کی مارننگ ہوسٹ بھی رہیں۔

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد جب وہ تربت واپس آئیں تو کئی آرٹسٹ خواتین وحضرات کے ساتھ مل کر ''مکران اکیڈمی آف آرٹس'' قائم کی۔ اُنہیں اکیڈمی کی چیئر پرسن منتخب کیا گیا۔ اور پھر اِسی اکیڈمی کے زیرِ اہتمام اُنہوں نے تربت میں ایک چار روزہ تاریخی پروگرام منعقد کیا۔ جس کے دو حصّے تھے، جن میں تربیتی ورکشاپ اور فن پاروں کی نمائش شامل تھی۔ تربیتی ورکشاپ میں 15 لڑکوں اور 15 لڑکیوں کو مصّوری کی تربیت دی گئی۔ جبکہ نمائش میں ورکشاپ کی بنائی گئی تصاویر کو دیکھنے کے لئے سجایا گیا۔ اس چار روزہ آرٹ پروگرام کو دیکھنے کے لئے سینکڑوں لوگ آئے جن میں بلوچستان سطح کی بعض اہم ترین شخصیات بھی شامل تھیں۔

محترمہ شاہینہ شاھین کے مزکورہ کارناموں سے شاید بعض بدنیّت قسم کے عناصر گھبرا گئے۔ جنہوں نے ایک منصوبے کے تحت اُن کے شوہر محراب گچکی کو استعمال کرتے ہوئے شاہینہ کو قتل کروا دیا۔ لہذا محترمہ شاہینہ شاھین کو اُن کے کارناموں کے لئے خراجِ تحسین پیش کی جاتی ہے، اُن کے قتل اور قاتلوں کی شدید مذمت کی جاتی ہے، اور قاتلوں کی فوری گرفتاری اور قرار واقعی سزاؤں کا پُرزور مطالبہ کیا جاتا ہے۔

(غنی پرواز، کوآرڈینیٹر، ایچ آر سی پی تربت ٹاسک فورس)

عدالت نے توہینِ رسالت کے ملزم کو سزائے موت سنا دی

لاہور ایڈیشنل سیشن جج لاہور منصور احمد قریشی نے توہینِ مذہب و رسالت کیس کا فیصلہ سنایا اور ملزم آصف پرویز کو تعزیراتِ پاکستان کی دفعہ 295 سی کے تحت سزائے موت اور 50 ہزار روپے جرمانہ عائد کیا۔ خیال رہے کہ سال 2013 میں تھانہ گرین ٹاؤن میں یوحنا آباد کے رہائشی 38 سالہ آصف پرویز کے خلاف پاکستان پینل کوڈ (تعزیراتِ پاکستان) کی دفعہ 295 اے، بی اور سی جبکہ ٹیلی گراف ایکٹ کی دفعہ 25 ڈی کے تحت مقدمہ درج کیا گیا تھا۔ یہاں یہ واضح رہے کہ تعزیراتِ پاکستان کی یہ دفعات توہینِ مذہب اور رسالت سے متعلق ہیں۔ اسی مقدمے کی سماعت کے بعد آج عدالت نے فیصلہ سنایا، عدالت میں آج ملزم کی طرف سے ایڈووکیٹ سیف الملوک پیش ہوئے۔ فیصلے کے مطابق تعزیراتِ پاکستان کی دفعہ 295 سی کے تحت آصف پرویز کو سزائے موت اور 50 ہزار روپے جرمانے کی سزا سنائی گئی۔ مزید یہ کہ اگر ملزم جرمانے کی رقم ادا کرنے میں ناکام رہتا ہے تو اُسے 6 ماہ کی سزا کاٹنی ہوگی۔ تاہم ملزم کو اِس سزا کے خلاف لاہور ہائیکورٹ میں اپیل دائر کرنے کا اختیار ہوگا۔ ایڈیشنل سیشن جج نے ٹیلی گراف ایکٹ کی دفعہ 25 ڈی کے تحت ملزم کو 3 سال قید کی سزا بھی سنائی۔ یاد رہے کہ ملزم کے خلاف مقدمہ سعید احمد کی مدعیت میں درج کیا گیا تھا، جس میں اس پر ایس ایم ایس کے ذریعے توہینِ مذہب و رسالت کا الزام لگایا گیا تھا۔ اس حوالے سے سامنے آنے والی تفصیل سے معلوم ہوا کہ ملزم آصف اور مدعی مقدمہ ایک ساتھ کپڑوں کی فیکٹری میں کام کرتے تھے۔ علاوہ ازیں ملزم کے وکیل کا کہنا تھا کہ اُن کا مؤکل 7 سال سے قید میں ہے اور وہ مذکورہ سزا کو لاہور ہائیکورٹ میں چیلنج کریں گے۔

(بشکریہ ڈان)

’2020 کے دوران ملک میں یومیہ 8 سے زائد بچے جنسی استحصال کا نشانہ بنے‘

لاہور ملک میں رواں سال کے ابتدائی چھ ماہ کے دوران ایک ہزار 489 بچوں کو جنسی استحصال کا نشانہ بنایا گیا یعنی گزشتہ سال کے اِسی عرصے کے مقابلے اس قسم کے واقعات میں 14 فیصد اضافہ ہوا۔ڈان اخبار کی رپورٹ کے مطابق 1996 سے بچوں کو جنسی استحصال سے تحفظ کے لیے کام کرنے والی غیر سرکاری تنظیم ساحل کی رپورٹ میں جنسی استحصال کے واقعات میں اضافے کی ایک وجہ کورونا وائرس عالمی وبا کو قرار دیا گیا کیوں کہ بچے گھروں میں تھے اور 55 فیصد واقعات میں استحصال کرنے والے جاننے والے تھے۔رپورٹ میں انکشاف ہوا کہ سال کے ابتدائی 6 ماہ کے دوران روزانہ 8 سے زائد بچے استحصال کا نشانہ بنے، جس میں سے 785 کم سن لڑکیاں اور 704 لڑکے شامل ہیں۔اس میں کیسز کے اعتبار سے دیکھا جائے تو اغوا کے 331، بدفعلی کے 233 بچوں کے لاپتا ہونے کے 168 ریپ کے 160، ریپ کی کوشش کے 134، گینگ بدفعلی کے 104، بدفعلی کی کوشش کے 93، گینگ ریپ کے 69، بچوں کی شادی کے 59 اور جنسی زیادتی کے بعد بچوں کے قتل کے 38 واقعات رپورٹ ہوئے۔مجموعی اعداد و شمار کے مطابق ان کیسز میں 53 فیصد لڑکیاں جبکہ 47 فیصد لڑکے استحصال کا شکار بنے۔اس میں 490 متاثرین کی عمر 11 سے 15 برس، اور 331 کی عمر 6 سے 10 سال کے درمیان تھی۔رپورٹ کے مطابق استحصال کے 57 فیصد واقعات پنجاب، 32 فیصد سندھ اور 6 فیصد خیبر پختونخوا میں رپورٹ ہوئے۔اسلام آباد میں 35 سے زائد، بلوچستان میں 22، گزاد کشمیر میں 10 اور گلگت بلتستان میں ایک کیس رپورٹ ہوا۔اسی طرح دیہی علاقوں میں بچوں کے استحصال کے واقعات کی شرح 62 فیصد جبکہ شہری علاقوں میں 38 فیصد رہی۔ڈیٹا سے یہ بات سامنے آئی کہ 90 فیصد کیسز کا پولیس کے پاس اندراج کروایا گیا، 135 کیسز کے اندراج کی خبر اخبارات میں شائع نہیں ہوئی، 7 کیسز پولیس میں درج نہیں کروائے گئے جبکہ 7 کیسز پولیس نے درج کرنے سے انکار کردیا۔رپورٹ کے مطابق 28 فیصد کیسز ان مجرمان کے گھروں میں رونما ہوئے جو بچوں کے جاننے والے تھے، 11 فیصد متاثرہ بچوں کے اپنے گھروں، 8 فیصد گلیوں، 4 فیصد کھیتوں جبکہ 11 فیصد کیسز دیگر مقامات پر رونما ہوئے۔رپورٹ ہونے والے تمام کیسز میں 59 فیصد مجرم جاننے والے، ایک فیصد اجنبی جبکہ 6 فیصد جاننے والے اجنبیوں کے ساتھ تھے۔ (بشکریہ ڈان)

صنف کی بنیاد پر تشدد

ایک رپورٹ کے مطابق، پاکستان بھر سے 629 لڑکیاں اور عورتیں چینی مردوں کو فروخت کی گئیں

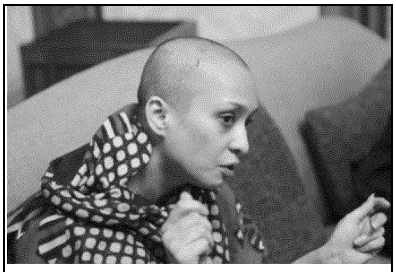

عاصمہ جنید کو اس کے خاوند نے بری طرح مارا پیٹا جب اس نے اپنے خاوند اور اس کے ملازمین کے سامنے ناچنے سے انکار کیا

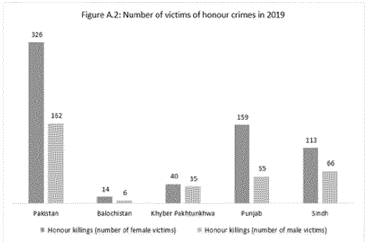

ذرائع: ایچ آر سی پی مانیٹر، اخبارات کی اطلاعات کی بنیاد پر

شکار پور میں پولیس نے 40 برس سے زائد عمر شخص کی 10 سالہ بچی سے شادی کی کوشش ناکام بنائی

ایچ آر سی پی کے کوائف بتاتے ہیں کہ 2019 کے دوران 'عزت' کے جرائم بلاک روک ٹوک جاری رہے اور سب سے زیادہ جرائم پنجاب سے سامنے آئے۔

سندھ پولیس کے کوائف معمولی حد تک مختلف ہیں جن میں دکھایا گیا کہ 2019 میں کم از کم 108 عورتیں 'عزت' کے نام پر قتل ہوئیں۔ اِس کے علاوہ، سندھ پولیس کے کوائف بتاتے ہیں کہ 2019 میں کام کے مقامات پر عورتوں کی ہراسانی کے 35 واقعات رپورٹ ہوئے۔

اعداد و شمار میں صنف کی بنیاد پر تشدد کے وہ واقعات شامل نہیں جو دارالحکومت اسلام آباد میں پیش آئے، مگر اسلام آباد پولیس سے علیحدہ طور پر لیے گئے کوائف ظاہر کرتے ہیں کہ عورتوں کے خلاف جرائم میں 2018 کی نسبت 2019 میں 38 فیصد اضافہ ہوا ہے۔ 2018 میں یہ تعداد 79 تھی جبکہ 2019 اس قسم کے 109 واقعات پیش آئے جن میں اغواء کے 31 اور جنسی تشدد کے 35 واقعات شامل تھے۔

نوٹ: اغوا کے مقدمات میں 249 مقدمات پر تحقیقات بند کر دی گئیں کہ ان واقعات میں عورتوں نے اپنی پسند کی شادی کر لی تھی۔

بچوں کے خلاف تشدد

این جی او ساحل نے 2019 میں بچوں کے خلاف تشدد کے 2,846 واقعات قلمبند کیے۔ 2018 میں ایسے واقعات کی تعداد 3,832 تھی۔ 64 فیصد (1,816) واقعات دیہی علاقوں سے اور 36 فیصد (1,030) شہری علاقوں سے رپورٹ ہوئے۔صنف کی بنیاد پر درجہ بندی کریں تو معلوم ہوگا کہ 1,524 (54 فیصد) واقعات میں متاثرین بچیاں تھیں؛ 1,322 (46 فیصد) واقعات میں متاثرین بچے تھے۔

سب سے زیادہ متاثرہ بچوں میں 6 سے 15 برس کی عمر کے بچے تھے جو کُل رپورٹ ہونے والے 54 فیصد واقعات کا نشانہ ہوئے۔ ساحل کے مطابق، 2019 میں شناخت ہونے والے 3,722 مجرموں میں سے (2,222) تقریباً 60 فیصد اُن بچوں کو جانتے تھے جن کا انہوں نے استحصال کیا تھا۔

ساحل کے صوبائی سطح پر پیش آنے والے واقعات سے متعلق کوائف ظاہر کرتے ہیں کہ کل 2,846 واقعات میں سے نصف سے زائد (53 فیصد) پنجاب سے، 30 فیصد سندھ سے، 7 فیصد اسلام آباد سے، 6 فیصد خیبر پختونخوا سے، 2 فیصد بلوچستان سے اور 2 فیصد سے کم واقعات آزاد جموں و کشمیر اور گلگت بلتستان سے رپورٹ ہوئے ہیں۔

یہ بات دہرانے کے قابل ہے کہ یہ تمام اعداد و شمار اخبارات میں رپورٹ ہونے والے واقعات کی تعداد پر مبنی ہیں جو کہ صوبوں کے اعداد و شمار میں فرق کی وجہ ہو سکتی ہے۔

(انگریزی ترجمہ، ایچ آر سی پی کی سالانہ رپورٹ: 2019 میں انسانی حقوق کی صورتِ حال سے اقتباس)

☆☆☆

بچے کی ہلاکت پر احتجاج

نوشکی 16 ستمبر کو ایشنگی کے رہائشی شکیل احمد کے بیٹے کی والات ضلعی ہیڈ کوارٹر ہسپتال میں ہوئی۔ نومولود بچے کے طبیعت خراب ہونے کی وجہ سے اسے کوئٹہ لے جایا جارہا تھا کہ ایمبولینس میں آکسیجن سلنڈر میں گیس ختم ہونے کی وجہ سے بچہ زندگی کی بازی ہار گیا۔ بچے کے لواحقین نے بطورِ احتجاج ہسپتال کے سامنے بچے کی میت رکھ کر احتجاج کیا۔ بچے کے والد شکیل احمد نے بتایا کہ ڈاکٹروں نے دورانِ علاج غفلت اور لاپروائی کا مظاہرہ کیا۔ ایمبولینس میں گیس بھی نہیں تھا جس وجہ بچے کی موت واقع ہوئی۔ وہ ایم ایس کے خلاف ایف آئی آر کرنا چاہتے ہیں ایس ایچ او کی یقینی دہانی پر بچے کے لواحقین نے احتجاج ختم کردیا۔ (محمد سعید بلوچ)

سول سوسائٹی کا جبری لاپتہ افراد کی بازیابی کے لیے احتجاجی مظاہرہ

حیدرآباد "سول سوسائٹی کا جبری گمشدہ افراد کا کیس لڑنے والے ہائی کورٹ کے وکیل محبّ آزادلغاری اور دیگر جبری گمشدہ افراد کی بازیابی کے لیے حیدرآباد پریس کلب کے سامنے سول سوسائٹی کی جانب سے احتجاجی مظاہرہ کیا گیا۔ جس کی قیادت ایڈوکیٹ محبّ آزاد کی اہلیہ عطرت آزادلغاری، مہران میرانی کی والدہ سکینہ میرانی، سوہنی جیویکی۔ اس موقع پر انہوں نے کہا کہ سندھ سے جبری طور پر لاپتہ کیے جانے والے واقعات میں اضافہ کے سبب پورے سندھ مین تشویش کی لہر پائی جارہی ہے اور سندھ سے جبری لاپتہ کیے گئے مہران میرانی, ہدایت اللہ جروار, امتیاز خاصخیلی , ریاض خاصخیلی، ڈاکٹر فتح محمد کھوسو، سید مسعود شاہ، پٹھان خان زہرانی اور دیگر کا اب تک کچھ پتہ نہیں چل سکا اور حکومت نے جبری لاپتہ افراد کے مسئلے پر مسلسل خاموشی اختیار کررکھی ہے۔ حال ہی میں حیدرآباد میں جبری گمشدہ لوگوں کا مقدمہ لڑنے والے ایڈوکیٹ محبّ آزادلغاری کو بھی مبینہ طور گرفتار کرکے لاپتہ کردیا گیا انہوں نے کہا کہ جبری گمشدگیاں عالمی قانون کی سنگین خلاف ورزی ہے۔ اگر ایڈوکیٹ محبّ لغاری سمیت دیگر جبری لاپتہ افراد کو فوری پر رہا نہ کیا گیا تو احتجاج کا دائرہ پورے سندھ میں وسیع کردیا جائے گا۔

(لالہ عبدالحلیم شیخ)

لیڈی ڈاکٹر کو ہراساں کرنے کا الزام

حیدرآباد سول ہسپتال حیدرآباد کے میڈیکل وارڈ نمبر 1 کے پروفیسر ڈاکٹر سمیع اللہ شیخ پر ایک لیڈی ڈاکٹر کوکب نے ہراساں کرنے کا الزام لگایا ہے۔ لیڈی ڈاکٹر نے یہ شکایت اپنے والد سے کی جو ہسپتال پہنچے اور ڈاکٹر سمیع کو تشدد کا نشانہ بنایا جس پر معاملے کا مارکیٹ تھانہ میں کیس درج کرلیا گیا۔ بتایا جاتا ہے کہ ایک لیڈی ڈاکٹر کوکب کی جانب سے سینئر پروفیسر ڈاکٹر سمیع اللہ شیخ پر اُسے ہراساں کرنے کا الزام لگایا گیا۔

معاملے کی اُس نے اپنے والد ڈاکٹر عبدالرحمٰن پیرزادہ سے شکایت کی جو ہسپتال پہنچے اور مبینہ طور پر آفس میں داخل ہوکر مذکورہ پروفیسر کو زدکوب کیا جس پر تشدد کا نشانہ بننے والے ڈاکٹر نے مارکیٹ تھانہ میں ایف آئی آر درج کرائی جس میں کہا گیا کہ ایک لیڈی ڈاکٹر کوکب اپنے والد کے ساتھ اُس کے آفس میں پہنچی، انہوں نے آفس کا دروازہ بند کیا اور لیڈی ڈاکٹر کے والد نے اُس پر تشدد کیا۔ بعد میں وارڈ میں موجود اسٹاف نے اُنہیں چھڑوایا۔ لیڈی ڈاکٹر کے والد جس کے خلاش مقدمہ درج ہوا، اُسے تاحال گرفتار نہیں کیا ہے۔

(لالہ عبدالحلیم شیخ)

خاتون پولیو ورکر کو قتل کی دھمکیاں

پشاور پشاور میں پولیو مہم کے دوران لیڈی ہیلتھ ورکرز کو سنگین نتائج کی دھمکیاں ملنا معمول بن گیا۔ ڈاکٹر شاہ نواز نے پولیس کو بتایا کہ وہ گزشتہ روز میں پولیو مہم کے دوران لیڈی ورکر مسماۃ زرکیہ بی بی کے ہمراہ شہاب خیل میں بچوں کو پولیو کے قطرے پلا رہے تھے کہ اس دوران ملزم عامر ولد حمداللہ نے مسماۃ زرکیہ بی بی کو دھکے دیکر گھر سے نکال دیا اور نازیبا کلمات ادا کئے، ملزم نے خاتون ورکر کو دوبارہ آنے کی صورت میں جان سے مارنے سمیت سنگین نتائج کی دھمکیاں بھی دین، پولیس نے ملزم کے خلاف مقدمہ درج کرکے تفتیش شروع کردی ہے۔ (نامہ نگار)

4 اور افراد غیر قانونی اسمگلنگ کی بھینٹ چڑھ گئے

نوشکی آر سی ڈی شاہراہ این 40 پر پدگ کے قریب بس اور کوچ کے حادثے میں 4 افراد جاں بحق اور 8 زخمی ہوگئے۔ سمگلرز پروبکس گاڑی میں پنجاب سے تعلق رکھنے والے افراد کو غیر قانونی طور پر ایران لے جارہے تھے 8 زخمیوں کو دالبندین ہسپتال میں طبی امداد دی گئی۔ نوشکی کے راستے بڑے پیمانے پر غیر قانونی طور ایران اور یورپ لے جانے کا کاروبار عروج پر ہے۔ بروبکس اور دیگر گاڑیوں میں ایران لے جانے والوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح دھونسا جاتا ہیں اور ان سے بھاری رقم بھی لی جاتی ہے۔ کوئٹہ سے تفتان تک پولیس لیویز ایف سی اور کسٹم کے ایک درجن سے زائد شاہراہ پر چیک پوسٹ واقع ہیں۔

(محمد سعید بلوچ)

بچی کی ہلاکت پر احتجاجی مظاہرہ

مورو شاہپور جہانان سے آئے ہوئے آصف علی کی بیٹی بیمار تھی۔ اُس کے والدین اسے علاج کے لیے تعلقہ ہسپتال مورو لائے۔ مگر تعلقہ ہاسپٹل مورو میں ڈیوٹی پر کوئی بھی ڈاکٹر نہ ہونے کی وجہ سے معصوم بچی وہیں تڑپ تڑپ کر فوت ہوگئی۔ فوتشدہ معصوم بچی کے ورثاء نے پریس کلب مورو کے سامنے احتجاج کیا۔ یاد رہے کہ کچھ ماہ پہلے بھی تعلقہ ہاسپٹل مورو میں دولت پور سے علاج کے لئے آنے والی معصوم بچی ڈاکٹروں کے احتجاج کے دوران علاج نہ ہونے کی وجہ سے تڑپ تڑپ کر فوت ہوگئی تھی۔

(الطاف سومرو)

خاتون کی خودسوزی کی کوشش

حیدرآباد 9 ستمبر کو حیدرآباد کے علاقے کھائی روڈ میں گھریلو جھگڑے کے بعد شادی شدہ عورت 30 سالہ عائشہ نے خودسوزی کی کوشش کی۔ اطلاع ملنے پر مارکیٹ پولیس اور ایدھی کے رضا کار جائے وقوع پر پہنچ گئے اور عائشہ کو تشویشناک حالت میں سول ہسپتال کے برنس وارڈ میں داخل کرادیا۔ ڈاکٹرز کا کہنا تھا کہ آگ سے خاتون کے جسم کا بڑا حصّہ متاثر ہوا۔ تاہم اس کی حالت خطرے سے باہر ہے اور علاج جاری ہے جبکہ مارکیٹ پولیس کا کہنا ہے کہ عائشہ کے بھائیوں نے الزام لگایا کہ عائشہ کو مبینہ طور پر اس کے شوہر نے جلانے کی کوشش کی ہے۔ تاہم خاتون نے اپنے بیان میں کہا کہ اُس نے شوہر کے ساتھ جھگڑوں سے تنگ آکر زندگی کا خاتمہ کرنے کے لئے خود کو آگ لگائی۔

(لالہ عبدالحلیم شیخ)

لڑکی سے زیادتی کی کوشش

چارسدہ علاقہ تھانہ ترناب کی حدود میں 10 سالہ بچی کو جنسی زیادتی کا نشانہ بنانے کی ناکام کوشش کو ناکام بنادیا گیا۔ملزم کو گرفتار کرلیا گیا ہے۔ملزم نے اپنے جرم کا اعتراف کرلیا ہے، مزید تفتیش جاری ہے۔ترناب کے رہائشی نے تھانہ ترناب میں رپورٹ درج کرتے ہوئے پولیس کو بتایا کہ میں اپنے اہل خانہ کے ساتھ گھر میں موجود تھا جبکہ میری 10 سالہ چھوٹی بچی قرآنِ مجید سیکھنے کیلئے قریبی محلے میں گئی ہوئی تھی۔واپسی پر حضرت علی ولد فضل حکیم ساکن غازو ڈھیرے راستے میں موجود تھا میری بچی کو دیکھ کر اس کے ساتھ بدفعلی کی کوشش کرنے لگا۔جس پر بچی نے شور مچایا اور ملزم موقع سے بھاگ گیا، تھانہ ترناب میں ملزم کے خلاف مقدمہ درج کرکے تفتیش شروع کردی گئی ہے۔

واقعے کا فوری نوٹس لیتے ہوئے ڈی پی او چارسدہ محمد شعیب خان نے ایس پی انوسٹی گیشن افتخار شاہ کی سربراہی میں ڈی ایس پی سٹی محمد اقبال خان، ایس ایچ او تھانہ ترناب زاہد خان اور انوسٹی گیشن افسران پر مشتمل ٹیم تشکیل دے کر ملزم کو جلد از جلد گرفتار کرنے کا ٹاسک دیا، تفتیشی ٹیم نے علاقہ میں ملزم کی گرفتاری کیلئے کاروائیاں شروع کیں اور اُسے گرفتار کیا، ملزم نے اپنے جرم کا اعتراف کرلیا ہے۔

(نامہ نگار)

پینے کے پانی عدم دستیابی

پشاور پشاور کے علاقہ یونین کونسل سلیمان خیل بڈھ بیر پی پینے کے پانی کے ٹیوب ویلز ناکارہ پڑے ہیں جس کی وجہ سے عوام کو شدید مشکلات کا سامنا ہے۔ یوسی سلیمان خیل کے رہائشیوں نے اس سلسلے میں بتایا کہ مذکورہ علاقے میں پینے کے پانی کیلئے قائم دو ٹیوب ویلز ڈیڑھ ماہ سے زائد عرصے سے خراب پڑے ہیں۔ ایک ٹیوب ویل کا ٹرانفسارمر جبکہ دوسرے کی واٹر موٹر خراب ہوچکی ہے جس سے محلّہ برکس، کوٹوالان، شیخان، باگڑخیل، شورہ خیل، محلّہ سیدی خیل، رخنہ اور محلّہ خان خیل کے دو ہزار سے زائد گھرانوں کو پانی نہیں مل رہا اور وہ ٹیوب ویلوں کی خرابی کے باعث دور دراز علاقوں سے پانی لا رہے ہیں۔ (روزنامہ مشرق)

ہسپتال میں طبی سہولیات یقینی بنائی جائیں

پشاور 14 ستمبر کو پیس فُل مشعال وزیرستان ایسوسی ایشن کے زیرِ اہتمام سب ڈویژن رزمک میں صحت عامہ کی ابتر صورتحال کے حوالے سے پشاور پریس کلب کے سامنے احتجاجی مظاہرہ کیا گیا۔مظاہرین نے ہاتھوں میں پلے کارڈز اور بینرز اٹھا رکھے تھے جس پر اُن کے مطالبات کے حق میں نعرے درج تھے۔مظاہرین کا کہنا تھا کہ سب ڈویژنل سول ہسپتال رزمک میں بنیادی سہولتوں کا فقدان ہونے کی وجہ سے علاقہ کے عوام کو شدید مشکلات کا سامنا ہے۔ہسپتال کی بیشتر آسامیاں خالی ہیں، لیڈی ڈاکٹر اور لیبر روم و دیگر مشنری کی عدم موجودگی کی وجہ سے مریضوں خصوصاً خواتین مریضوں کے علاج معالجے میں سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔انہوں نے مزید کہا کہ علاقہ میں دیگر ترقیاتی کام بھی نہ ہونے کے برابر ہیں اور لوگ بجلی جیسی بنیادی انسانی ضرورت سے محروم ہیں۔

(نامہ نگار)

13 سالہ لڑکے کی لاش برآمد

سوات 21 ستمبر کو مدین میں 13 سالہ لڑکے کی لاش برآمد ہوئی ہے جس کے جسم پر تشدد کے نشانات ہیں، پولیس کے مطابق گزشتہ روز مدین کے علاقے تیرات میں تیرہ سالہ لڑکے اجمل ولد علی باز کی لاش ملی جس کے جسم پر تشدد کے نشانات موجود تھے۔ پولیس نے مقدمہ درج کرکے تفتیش شروع کردی ہے۔

(روزنامہ آج)

7 سالہ بچے پر جنسی تشدد

ہری پور 13 ستمبر کو ہری پور چھپر روڈ محلّہ فاروق اعظم میں سات سالہ بچے کے ساتھ جنسی تشدد کا واقعہ پیش آیا ہے۔ ہری پور تھانہ سٹی کی حدود چھپر روڈ صدیق اعظم کا رہائشی ملزم ذیشان رزاق ولد عبدالرزاق سکنہ چینتری حال محلّہ فاروق اعظم کے شبیر ولد نصیب اللہ کو بہلا پھسلا کر اپنے ساتھ لے گیا اور بچے کے ساتھ بدفعلی کی اور بچے کو پیسے دے کر کہا کہ وہ اس بارے میں کسی کو کچھ نہ بتائے۔ جب شام کو بچے کا والد گھر واپس آیا تو دیکھا کہ بچے کی حالت غیر ہے۔اُس نے بچے سے پوچھ گچھ کی جس پر بچے نے پورا واقعہ بتایا۔جس پر نصیب اللہ بچے کو لیکر تھانہ سٹی گیا اور ایف آئی آر درج کروائی۔تھانہ سٹی کے ایس ایچ او صدیق شاہ نے ملزم ذیشان رزاق کے خلاف مقدمہ درج کرکے کاروائی کرتے ہوئے ملزم ذیشان کو حراست میں لے کر پابند سلاسل کردیا۔

(نامہ نگار)

لاپتہ 5 سالہ بچے کی مسخ شدہ نعش برآمد

ٹانک ٹانک کے نواحی علاقہ خان کلہ سے چند روز پہلے لاپتہ ہونے والے پانچ سالہ معصوم بچے کی مسخ شدہ نعش سلیمان زیارت کے قریب سے برآمد ہوئی ہے۔ بچے کی شناخت کیلئے ڈی این اے ٹیسٹ کے نمونے پولیس کو فراہم کردیئے گئے تھے۔ چند روز پہلے ٹانک کے علاقہ عمر خان کلہ سے پانچ سالہ معصوم بچہ شاہد گھر سے لاپتہ ہوگیا، سات روز بعد مذکورہ گاؤں میں سلیمان زیارت کے قریب بکریاں چرانے والے کو بچے کی نعش کا ڈھانچہ نظر آیا جس پر گوشت نہیں تھا۔اُس نے پولیس کو اطلاع دی، پولیس نے موقع پر پہنچ کر بچے کی نعش تحویل میں لیکر مقدمہ درج کرکے تفتیش شروع کردی ہے۔

(روزنامہ آج)

خواجہ سراء کو قتل کی دھمکیاں

پشاور پشاور میں ایک اور خواجہ سراء گل پانڑہ کے قتل کے بعد ایک اور خواجہ سراء کو جان سے مارنے کی دھمکیاں ملنا شروع ہوگئیں۔خواجہ سراء ناصر عرف مانو نے رپوٹ درج کراتے ہوئے تھانہ گلبرگ پولیس کو بتایا کہ گزشتہ روز وہ اپنے ساتھی خواجہ سراؤں کے ہمراہ اپنے فلیٹ پر موجود تھا کہ اس دوران عابد اور اس کے ساتھی آئے اور عابد نے اُسے جان سے مارنے اور دیگر سنگین دھمکیاں دیں اور چلا گیا، پولیس نے ملزم کے خلاف مقدمہ درج کرلیا۔

(روزنامہ مشرق)

اسلام آباد: 21 تا 23 ستمبر 2020 : سماجی شہریت اور انسانی حقوق پر تین روزہ تربیتی ورکشاپ کا انعقاد

22 ستمبر 2020

عزیز ساتھیو!

(انتخابات 2020-2023)

کونسل کے انتخابات کی نئی تاریخ کا اعلان

میں آپ کو مطلع کرنا چاہتا ہوں کہ کونسل کے انتخابات کی پہلے جاری ہونے والی تاریخ (یکم نومبر 2020) والے دن سپریم کورٹ بار ایسوسی ایشن کے انتخابات ہو رہے ہیں۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر کہ ایچ آر سی کی جنرل باڈی کے کئی اراکین قانونی برادری کا حصہ ہیں، ایچ آر سی پی نے اپنی کونسل کے انتخابات 8 نومبر بروز اتوار تک ملتوی کرنے کا فیصلہ کیا ہے تاکہ کمیشن کے اراکین کے لیے سہولت پیدا کی جا سکے۔

بیرون شہر سے تعلق رکھنے والے تمام اراکین جن کے واجبات ادا ہیں، کو پوسٹل بیلٹ 16 ستمبر کو بھیج دیے گئے تھے۔ جو مقامی اراکین یہ سہولت حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ 26 اکتوبر 2020 تک (صبح 11 بجے سے شام 4 بجے کے دوران) ایچ آر سی پی کے مرکزی دفتر آ کر انتخابی کمیٹی سے پوسٹل بیلٹ لے سکتے ہیں۔ تمام پوسٹل بیلٹ کمیٹی کو موصول ہونے چاہئیں تاکہ وہ **2** نومبر **2020** تک یا اس پہلے مرکزی دفتر پہنچ جائیں۔

پولنگ اتوار **8** نومبر کو صبح **9** بجے سے دوپہر **2** بجے تک جاری رہے گی

شکریہ

افتخار بٹ

چیئرپرسن

ایچ آر سی پی انتخابی کمیٹی

پبلشر: ندیم فاضل: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق
"ایوان جمہور" 107۔ ٹیپو بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور
فون: 35838341-35864994 فیکس: 35883582
ای میل hrcp@hrcp-web.org ویب سائٹ: www.hrcp-web.org
پرنٹر: مکتبہ جدید پریس، 14 ایمپرس، لاہور Registered No. LRL-15

اظہارِ لاتعلقی: براہِ مہربانی نوٹ کر لیں کہ فریڈرک نومان فاؤنڈیشن فار فریڈم (ایف این ایف) کا جہدِ حق کے متن سے متفق ہونا ضروری نہیں۔ لہٰذا، جہدِ حق میں شامل مواد و خیالات کی ذمہ داری کسی طور پر بھی ایف این ایف پر عائد نہیں کی جا سکتی۔
اظہارِ تشکر: جہدِ حق کی اشاعت کے لیے فریڈرک نومان فاؤنڈیشن فار فریڈم (ایف این ایف) نے مالی معاونت کی ہے جس کے لیے ایچ آر سی پی، ایف این ایف کا انتہائی مشکور ہے۔